ماھنامہ

ماھنامہ

آنکھ مچولی

جون ۱۹۹۱ء

کراچی

اس شمارے کے ساتھ اپنے کمسن بہن بھائیوں
اور نوعمر طالب علموں کے لئے آنکھ مچولی کا تحفہ
تِتلی مفت حاصل کیجئے

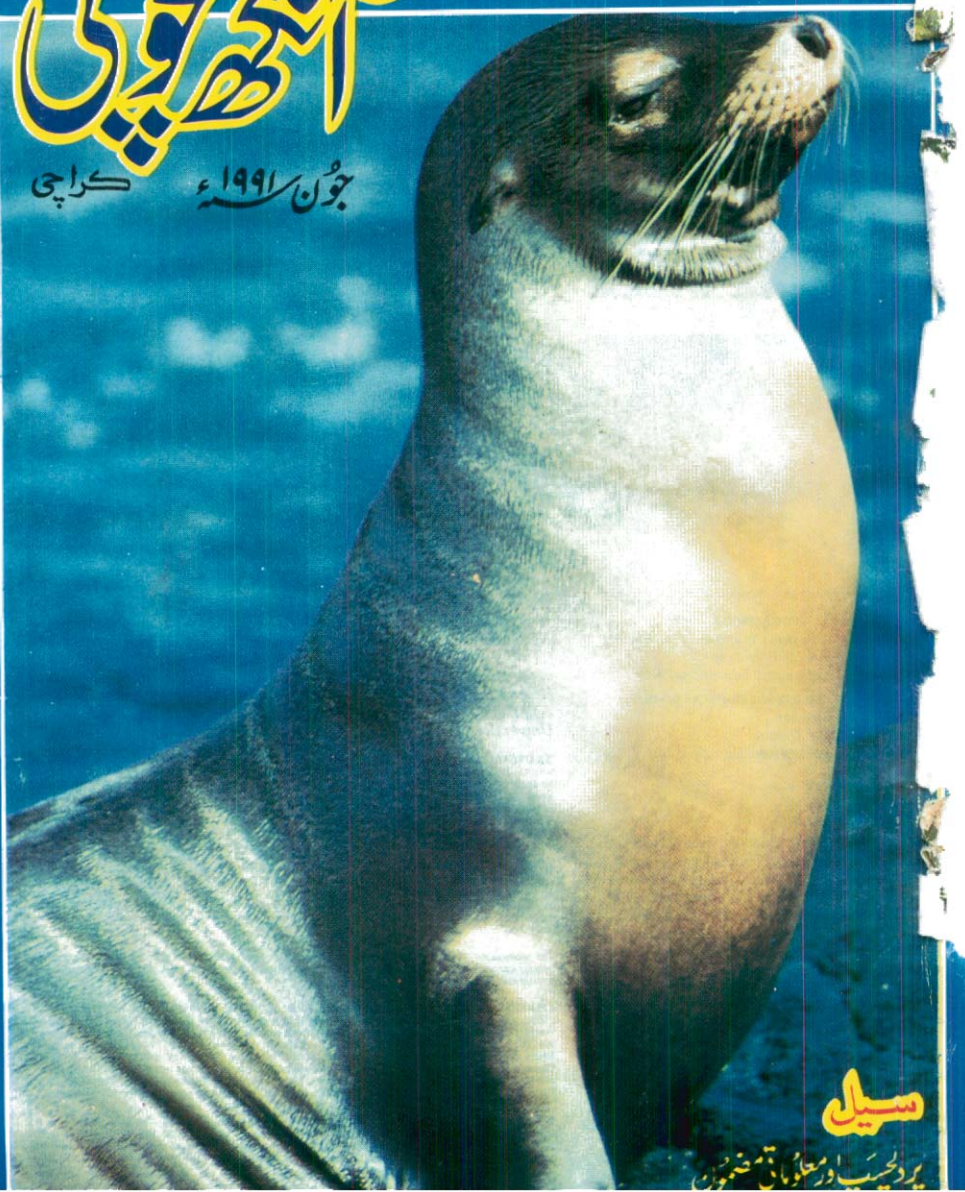

گرم جوش دوستی
باتا®

قائم شدہ ۱۹۴۱

جائیے —!
ہم آپ سے نہیں بولتے۔

دیکھئے نا —! حرا۔ شیزا۔ کرن اور فرخ سب کے
اکاؤنٹ حبیب بینک میں ہیں مگر آپ نے اب تک
میرا اکاؤنٹ نہیں کھلوایا۔

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

manhattan International

پی آئی اے کی ہفتہ وار پرواز

مشہد

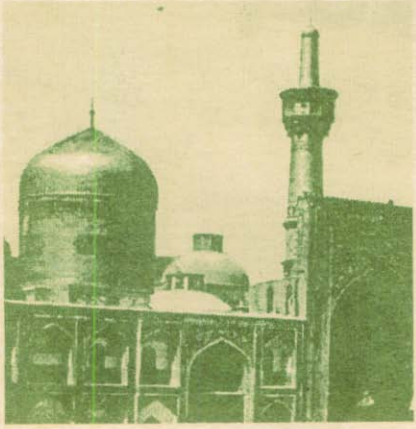

دیرینہ تعلقات کی تجدید

۲ر جون ۱۹۹۱ء سے مشہد پی آئی اے کی ۷۷ ویں منزل
اب ہر اتوار، پاکستان انٹرنیشنل آپ کے لئے صوبائی
دارالحکومت کوئٹہ سے مشہد کے مقدس شہر تک براہ راست
پرواز فراہم کرتی ہے۔
یہ نیا رابطہ پاکستان اور ایران کے درمیان ثقافتی اور
روحانی رشتوں کو مزید استوار کرتا ہے۔

اتوار	دن	اتوار
257	فلائٹ نمبر	737
737	پرواز	737
CY	درجہ	CY
0920	روانگی کوئٹہ آمد ▲	1510
1015 ▼	آمد مشہد روانگی	1115

PIA
پی آئی اے
پاکستان انٹرنیشنل
پاکستان لوگ۔ لاجواب پرواز

PID(ISLAMABAD)

IAL-PIA-7-91

بہترین رسالے کا ایوارڈ حاصل کرنے والا پاکستانی بچوں کا واحد ماہنامہ

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

مدیر اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول

تجمل حسین چشتی

مشاورت

مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی

طاہر مسعود محمد سلیم مغل

مجلس ادارت

شاہ نواز فاروقی ساجد سعید منیر احمد راشد

اشتہارات

محمد عرفان

سرکولیشن

ریاض احمد

نمائندہ امریکہ

عبدالرشید خان

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا

جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۱۲ جون ۱۹۹۱ء ذیقعد، ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ فون ۲۹۹۱۷۸

ناشر: ظفر محمود شیخ ، طابع: زاہد علی ، مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ، کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی - گرین گائیڈ اکیڈمی - ۱۱۲-ڈی، نورس روڈ سائٹ، کراچی

۱۰ روپے ۷ درہم ۷ ریال

تاریخ کے دریچے سے	ادارہ	۸
پہلی بات	ظفر محمود شیخ	۹
ڈیئر ایڈیٹر	خطوں کے جواب	۱۱
حضورؐ کے ایک صحابیؓ	کاشف طاہر	۱۵
کشمیر کی فریاد (نظم)	سیّد نظر زیدی	۱۷
فاتح کی شکست	اخگر انوار اعوان	۱۹
سُرخ موت	آصف فرّخی	۲۵
خواہش	عطا حسین ملک	۳۱
آزادی	سیّد نظر زیدی	۳۶
بادشاہی مسجد	گلفام	۴۵
جھینگر اور کاکروچ (نظم)	شاہنواز فاروقی	۴۸
چاندی نگر میں سونا	شاہنواز فاروقی	۵۱
قیدی	فاروق عادل	۵۹
جادوئی آنکھ	ساجد سعید	۶۴
پمپئی کا زلزلہ	سلمیٰ سلیم	۶۷

حسنِ ترتیب

گرین لینڈ کی سیلیں ــــــ سیّد عرفان علی یوسف ــــــ ۷۰
محنت کی عظمت (نظم) ــــــ امان اللہ نیّر شوکت ــــــ ۷۸
خُوشی کی تلاش ــــــ مس فرحین ــــــ ۷۹
ڈنڈا ڈولی ــــــ قارئین ــــــ ۸۳
پہلا شکار ــــــ منیر احمد راشد ــــــ ۸۷
فطرت کی دُنیا ــــــ شین فاروقی ــــــ ۹۵
فیصلہ ــــــ عامر یونس ــــــ ۹۹
قصّہ ایک سفید خرگوش کا ــــــ ثاقبہ رحیم الدین ــــــ ۱۰۴
بھلی گرم ــــــ ابنِ آس ــــــ ۱۰۹
مَیں کون ہوں (نظم) ــــــ پروفیسر عنایت علی خان ــــــ ۱۱۶
برقی موٹر بنائیے ــــــ جنید فاروقی ــــــ ۱۱۷
چوہے کا چوہا (نظم) ــــــ عنبر چغتائی ــــــ ۱۱۹
کم سن قلم کار ــــــ قارئین ــــــ ۱۲۱
روشن مثال ــــــ تعارف ــــــ ۱۳۳
امّی ابّو کا صفحہ ــــــ ہُما تسلیم ــــــ ۱۳۶

تاریخ کے دریچے سے

سکندر اعظم کا جواب:۔

ارسطو کے ہاں مختلف ممالک کے شہزادے زیر تعلیم تھے ایک روز ایک شہزادے سے ارسطو نے سوال کیا "اگر تمہیں بادشاہت ملے تو میری تعلیمی خدمات کا صلہ کس صورت میں دو گے؟" شہزادے نے جواب دیا "میں تمام تر مہماتِ سلطنت میں آپ کے مشورے کو مقدم رکھوں گا" یہی سوال دوسرے شہزاے سے کیا اس نے جواب دیا "میں آپ کو برابر کا شریک رکھوں گا" جب سکندر کی باری آئی تو اس نے عرض کی

"مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا جائے کیونکہ اس کا فاعل حقیقی میں خود نہیں بلکہ خدائے برتر ہو گا"

ارسطو اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہنے لگا

"تیری اس دانائی کا جواب سب پر سبقت لے گیا، اور مجھے تیرے اس جواب سے تیرے فاتح عالم ہونے کی بو آتی ہے۔"

پہلی بات

کسی باغ کی کڑی دھوپ میں ایک بوڑھا پسینے میں شرابور نہایت محنت سے ایک پودا لگانے میں مصروف تھا۔ کسی راہ گیر نے حیرت سے پوچھا۔ "بڑے میاں! تم یہ تکلیف کیوں اٹھا رہے ہو جب یہ پودا بڑھ کر درخت بنے گا اور اس میں پھل آئیں گے، اس وقت تک تم اس درخت کا پھل کھانے کے لئے کہاں زندہ رہو گے؟"

بوڑھا یہ سن کر مسکرایا۔ پھر اس نے دانشمندی سے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے۔ مگر میں یہ پودا اپنے لئے کب لگا رہا ہوں۔ یہ تو دوسروں کے لئے ہے اور پھر میں نے جن درختوں کے پھل کھائے ہیں انہیں میں نے کب بویا تھا۔" بوڑھے کی اس بات میں انسانیت کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ آج ہمیں جتنی سہولتیں اور آسائشیں میسر ہیں وہ ایثار و قربانی کے اسی جذبے کی بدولت ہیں۔ انسانوں کو ہمیشہ ایسے ہی عظیم لوگوں سے فائدہ پہنچا ہے جنہوں نے اپنی راتوں کی نیند حرام کی تاکہ دوسرے چین سے سو سکیں۔ خود تکلیفیں اٹھائیں تاکہ دوسروں کو سہولتیں مہیا کر سکیں۔ یہ طیارے، بحری جہاز، ریل گاڑیاں، بسیں اور کاریں جنہوں نے فاصلوں کو مختصر کر دیا ہے۔ یہ بجلی کے بلب، ٹیلی فون، ٹیلی گراف، ٹیلی وژن، ریڈیو اور اخبار جن سے ہماری زندگی میں انقلابی تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ یہ طرح طرح کی بیماری کا علاج کرنے والی دوائیں جن سے ہم صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ ان ساری کامیابیوں کے پیچھے ہزاروں انسانوں کی قربانیاں ہیں جن سے آج دنیا کی چہل پہل اور رونقیں ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کے ہمیں نام تک نہیں معلوم لیکن ان کی خدمات کے سامنے ہمارے سر عقیدت و احترام سے جھکے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی عمریں کھپا کر ہمیں یہ سبق دیا کہ "جب تک زندہ رہو، انسانوں کی بھلائی کے لئے سوچو اور ان کے کام آؤ۔"

آپ دیکھتے ہیں کہ آج چاروں طرف نفسانفسی کا عالم ہے، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں خود غرضی بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگ اپنی ناک سے آگے دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں جس کی وجہ سے دکھوں اور تکلیفوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہم ایثار و قربانی کی باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن مصیبت پڑنے پر اپنے ہی کسی بھائی کی مدد سے آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ اس طرح ان زبانی کلامی باتوں کی بھی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ ہمارا قول تو اس وقت اعتبار کے لائق ہو گا جب ہمارا عمل اس کی گواہی دے اور سب سے اہم سوال بھی یہی ہے کہ ہمارا عمل ہمارے قول کی گواہی آخر کب دے گا؟

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

با ادب با ملاحظہ ہوشیار

آنکھ مچولی کا حیرت ناک نمبر آرہا ہے

اس نمبر کی چند حیرت بکھیرنے والی پھلجڑیاں

○ ..... وہ کہانیاں جنہیں پڑھ کر آپ مارے حیرت کے پلکیں جھپکنا بھول جائیں۔

○ ..... ایسے واقعات جن کو پڑھ کر آپ کے منہ حیرت سے انگریزی حرف ○ کی طرح ہو جائیں۔

○ ..... ایسی تصاویر جن پر آپ کے لئے یقین کرنا مشکل ہو جائے۔

○ ..... علامہ حیرت کے حیرت ناک انکشافات.....

○ ..... حیرت کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے قصے اور حیرت کی کشتی میں سوار حیران کن "تحفہ"

○ ..... اس کے علاوہ وہ سب کچھ جو آپ کو حیرت میں ڈال دے

"حیرت ناک نمبر" آئندہ ماہ شائع ہو رہا ہے ○ آپ اپنا شمارہ ابھی سے محفوظ کرا لیجئے

آنکھ مچولی کا "حیرت ناک نمبر۔"

آپ پڑھیں گے جیسے جیسے

آپ کہیں گے کیسے کیسے؟

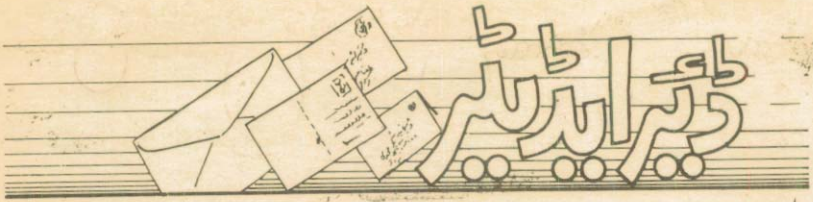

ڈیئر ایڈیٹر

علی فرہاد حمید، لاہور ...... حکومت تعلیمی پالیسی بنا رہی ہے۔ میرے خیال میں کوئی تعلیمی پالیسی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک طالب علموں سے نہ پوچھا جائے کہ وہ موجودہ تعلیمی نظام سے کیوں مطمئن نہیں۔ اور وہ اس نظام میں کیا تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ آپ "آنکھ مچولی" میں طالب علموں کو دعوت دیں کہ وہ اپنے تعلیمی مسائل بیان کریں اور ساتھ ہی اپنی سفارشات بھی دیں۔ میں نے نصاب کی خرابیاں دور کرنے کے لئے تجاویز تیار کرلی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو ارسال کر سکتا ہوں۔

○ .... تعلیمی پالیسی بنانا ماہرین تعلیم اور حکومت کا کام ہے۔ انہیں ان کا کام کرنے دیجئے۔ طالب علموں کی عمر اور تجربہ اتنا نہیں ہوتا کہ وہ اتنی بڑی ذمہ داری کو ادا کر سکیں۔ البتہ آپ چاہیں تو اپنی تجاویز وزارت تعلیم کو بھجوا سکتے ہیں۔

محمد حسنین علی شاہ، پشاور ...... میرے دوست شکایت کرتے ہیں کہ رسالے کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ حالاں کہ لوگ اتنے فضول خرچ ہوگے ہیں کہ پچاس پچاس روپے کی آئس کریم چٹ کر جاتے ہیں لیکن دس روپے کا "آنکھ مچولی" نہیں خرید سکتے۔

○ .... آپ کا کہنا ٹھیک ہی ہے۔ قیمت بڑھنے کی شکایت ایسے بچے کریں جو واقعی غریب ہوں تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن حیرت ہے کہ زیادہ تر شکایتیں ان کی جانب سے آتی ہیں جن کے لئے دس روپے خرچ کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔

ندیم شہزاد، سلانوالی ...... انکل! جب سے میں نے آپ کا رسالہ پڑھنا شروع کیا ہے آج تک اپنی

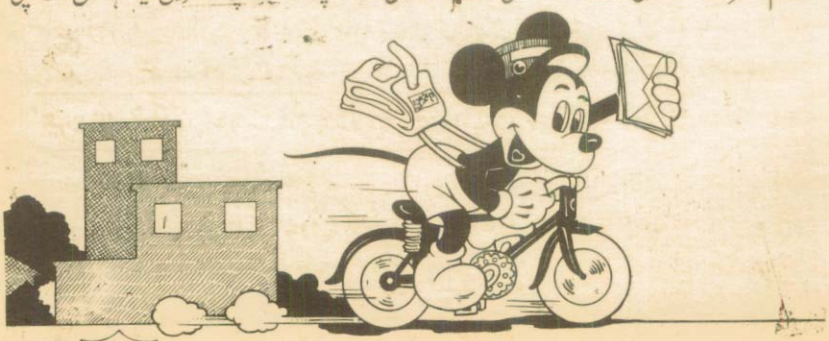

بستی سلانوالی کا نام رسالے میں نہیں پڑھا۔ ہم بھی اپنی بستی کا نام روشن کرنا چاہتے ہیں، ہماری بھی کوئی چیز شائع کیجئے نا۔

○ ..... بیٹے ! آپ کی خواہش تو بہت اچھی ہے۔ لیکن اپنی بستی کا نام آپ اپنی محنت، لگن اور کام سے ہی روشن کر سکتے ہیں۔ کوئی اچھی تحریر بھیجئے گا تو ضرور شائع ہوگی۔

بدر منیزہ، لیاقت آباد۔ کراچی ..... انکل ! ایک خوشخبری ہے کہ میں بی ایس سی فائنل میں فرسٹ آئی ہوں۔ ایک مشورہ ہے کہ رسالے میں ایک صفحہ مصوری کے لئے مخصوص کر دیجئے اس کے علاوہ علامہ اقبال، مولانا حالی اور اکبر الہ آبادی کے نصیحت آموز اشعار بھی شائع کیجئے۔

○ ..... بھئی آپ کو ڈھیروں مبارک باد۔ آپ کی تجاویز پر غور کیا جائے گا۔ نصیحت آموز اشعار شائع تو کر دیں لیکن آج کل لوگ نصیحت پر کان کہاں دھرتے ہیں۔

سعدیہ عزیز۔ پشاور کینٹ ..... اپریل کے شمارے میں محترمہ نسرین اعجاز کی کہانی "پاگل کون ؟" نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ کہانی میں کس خوبصورت انداز میں یہ جملہ لکھا گیا ہے "لیڈر تو ہمیشہ اونچے رہتے ہیں نیچے تو عوام ہوتے ہیں" یہ کہانی پڑھ کر مجھے تو اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔

○ ..... اچھی کہانی آئینہ ہوتی ہے جن میں ہم لوگ اپنا چہرہ دیکھتے ہیں۔ "پاگل کون" واقعی متاثر کن کہانی تھی۔

محمد معاذ اللہ خان سنبل۔ بوریوالہ ..... میں نے شیکسپیئر کے ڈرامے "دی مرچنٹ آف وینس" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ آپ اگر چھاپنا پسند کریں تو بھیج دوں۔

○ ..... کام تو آپ نے واقعی زبردست کیا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس ڈرامے کا پہلے ہی ترجمہ ہو چکا ہے۔ آپ اس کے علاوہ کسی تحریر کا ترجمہ کریں تو ضرور بھیج دیں۔ اس میں پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

محمد ساجد (؟) ..... رسالے میں انعامی سلسلے کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اپریل کے لطائف معیاری نہیں تھے۔ شمارے کا ٹائٹل بھی مزیدار نہیں تھا۔ رسالے نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھا ہے۔

○ ..... بہت خوب۔ آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ رسالے نے اپنے خراب معیار کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ اتنی خوبصورت تنقید کا شکریہ۔

پرنس امیر خان، پٹھان کالونی، کراچی ..... برائے مہربانی چند سوالوں کا جواب دے دیں۔ (۱) انعامی لطیفے پر آپ کیا انعام دیتے ہیں۔ ؟ (۲) "غزل پزل" کا سلسلہ کیوں بند کر دیا گیا۔ ؟ (۳) قلمی دوستی کی شرائط سخت کیوں ہیں۔ ؟ (۴) مزاحیہ مضامین کا اتنا فقدان کیوں ہے ؟

○ ..... جواب نوٹ فرمالیں ..... (۱) انعامی لطیفے پر انعام میں کوئی اچھی سی کتاب دی جاتی ہے۔ (۲) اس

سے پہلے کہ آپ لوگ اسے بند کرنے کے لئے کہتے، اسے بند کر دیا گیا۔ (۳) دوستی آسانی سے تو نہیں ہوتی۔ (۴) "انتا" فقدان بھی نہیں ہے۔

ثونیہ افضل، تاندلیانوالہ ..... انکل! میں کلاس فورتھ سے آپ کا رسالہ پڑھ رہی ہوں اور اب میں سیکنڈ ایئر میں آچکی ہوں تو میری دوست میرا مذاق اڑاتی ہیں کہ اتنی بڑی ہو کر بھی بچوں والا رسالہ پڑھتی ہو۔ خیر، میں رسالہ پڑھنا نہیں چھوڑوں گی لیکن ان کا مذاق برداشت کروں گی۔

○ ..... پہلی بات تو یہ ہے آنکھ مچولی ننھے بچوں کا رسالہ نہیں ہے۔ اگر یہ ننھے بچوں کا رسالہ ہوتا تو ہم علیحدہ سے "تتلی" کا شمارہ کیوں دیتے۔ دوسرے یہ کہ آپ اپنی دوستوں سے کہیں کہ وہ ایک مرتبہ آنکھ مچولی شروع سے آخر تک پڑھ جائیں اس کے بعد اپنی رائے دیں۔ اور آپ ان باتوں سے ہمت نہ ہاریئے۔ لوگ فلمی رسالے پڑھتے نہیں شرماتے آپ تو پھر ایک معلوماتی رسالہ پڑھتی ہیں۔

نائلہ صدیقی، پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی ..... رسالے پر ورق گردانی کرتے ہوئے اچانک اپنے مضمون پر نظر پڑی پھر جو ہماری حالت ہوئی اس سے گھر والوں کو اندازہ ہو گیا کہ ہمارا کوئی مضمون شائع ہو گیا ہے۔ "حیرتناک نمبر" کا شدت سے انتظار ہے۔ اشتہار دے کر آتش شوق کو کیسے بھڑکایا جا سکتا ہے اس فن سے آپ خوب واقف ہیں۔

○ ..... آپ کا مضمون پڑھ کر ہماری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوئی تھی۔ "حیرتناک نمبر" کا ابھی تو آپ نے صرف اشتہار پڑھا ہے "حیرتناک نمبر" پڑھ کر آپ حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے پر مجبور ہو جائیں گی۔

ظہیر چراغ (؟) ..... اپریل کے شمارے میں صفحہ نمبر ۲۷ پر ایک تصویر کے نیچے پینگوئن لکھا گیا ہے حالاں کہ وہ تصویر "کیوی" کی ہے۔ براہ کرم اس کی اصلاح کر دیں۔

○ ..... اصلاح کا شکریہ۔ واقعی عجلت میں یہ غلطی ہو گئی۔ جیسے آپ جلدی میں اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئے۔

رفاقت اللہ یوسف زئی۔ ڈیرہ اسماعیل خاں ..... میں ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھتا ہوں لیکن مجال ہے جو کبھی اپنا نام رسالے میں نظر آیا ہو۔ تعریفی خط آپ شائع نہیں کرتے اور باقی رہی تنقید تو رسالے میں ایسی کوئی بات ہوتی ہی نہیں کہ تنقید کی جا سکے۔

○ ..... آپ کا یہ وار کارگر ہوا۔ لیجئے خوش ہو جایئے۔ خط شائع ہو رہا ہے۔ لیکن بھائی! رسالے میں تنقید کی بڑی گنجائش ہے۔ یقین نہ آئے تو اسی صفحے پر اپنے ساتھیوں کے خطوط پڑھ لیں۔

محمود عرفانی، ہیڈ ماسٹر دینہ اسکول، لاڑکانہ ..... آپ کا رسالہ چھوٹے بچوں اور بچیوں کے

اخلاق و کردار کی تعمیر اور ان کی تعلیم و تربیت نہایت عمدہ طور پر کر رہا ہے۔ میری تمام بھتیجیاں اور اسکول کے طلباء و طالبات اس خوبصورت اور معیاری ماہنامے کو ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ وہ رسالہ ہے جس پر پاکستان کے تمام بچے اور بڑے فخر کر سکتے ہیں۔

○ ..... محترم عرفانی صاحب ! آپ کی تعریف ہمارے لئے ایک سند ہے کیوں کہ آپ استاد ہیں اور وہی خدمت جو آپ اسکول کی سطح پر انجام دے رہے ہیں، ہم اپنے رسالے کے ذریعے اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ تاہم آپ کی رہنمائی اور مشوروں کی ہمیں ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

عمارہ احمد، لاہور ..... اس مرتبہ آنکھ مچولی میں پہلے سے چھپا ہوا لطیفہ دوبارہ چھاپ دیا گیا ہے، اسے کیا کہئے ؟ انکل ! کیا ہم آنکھ مچولی میں کوئی اپیل چھپوا سکتے ہیں، کیا اس کی کوئی فیس بھی ہوگی ؟

○ ..... اب تک ہم اتنے لطیفے چھاپ چکے ہیں کہ انہیں یاد رکھنا مشکل ہے۔ پڑھنے والوں کو بھی یاد نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ ہر پڑھنے والے کا حافظہ آپ جتنا اچھا تو نہیں ہو سکتا۔ اپیل کس قسم کی ہے۔ اگر پڑھنے والوں کے لئے مفید ہوئی تو مفت بھی چھاپی جا سکتی ہے۔

سید انجم عمران (؟) ..... آپ کے رسالے میں بچوں کی مہماتی، مزاحیہ ٹائپ جاسوسی کہانیوں کی از حد کمی محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اب یہ مشن میں ہی سنبھال لوں اور بچوں کے لئے تعمیری اور جاسوسی ٹائپ کہانیاں لکھوں۔ امید ہے آپ حوصلہ افزائی کریں گے۔

○ ..... بھئی آپ نے تو خاصا بڑا مشن سنبھالنے کا عزم کر لیا۔ ایسی جاسوسی کہانیاں جس میں کوئی سبق یا پیغام نہ ہو، ہم اسی لئے نہیں چھاپتے کہ اسے پڑھ کر ہمارے ساتھی خیالی جاسوس بن جاتے ہیں اور خیالوں خیالوں میں مجرموں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دیتے ہیں۔

مونا سیّد احمد (؟) ..... آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو میں صدمے سے بیمار ہو جاؤں گی پھر میں مر جاؤں گی اور میری موت کے پیچھے آپ کا ہاتھ ہوگا۔ لہٰذا خط شائع کرنا نہ بھولئے گا۔

○ ..... خدا نہ کرے۔ مگر کیا آپ اتنی ذرا سی بات پر یہ سب کچھ کر گزریں گی۔ مونا بیٹی ! اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ زندگی کی کسی اچھے اور بڑے مقصد کے لئے قدر کیجئے۔ خط وغیرہ شائع ہونا تو بہت چھوٹی سی بات ہے۔

عثمان عنبر قاضی آباد، ضلع دیر ..... چند طباعتی غلطیوں کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ آئندہ خیال رکھا کیجئے۔

○ ..... آپ نے بیک وقت تین چار غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور بالکل صحیح کی ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ آئندہ خیال رکھا جائے گا۔

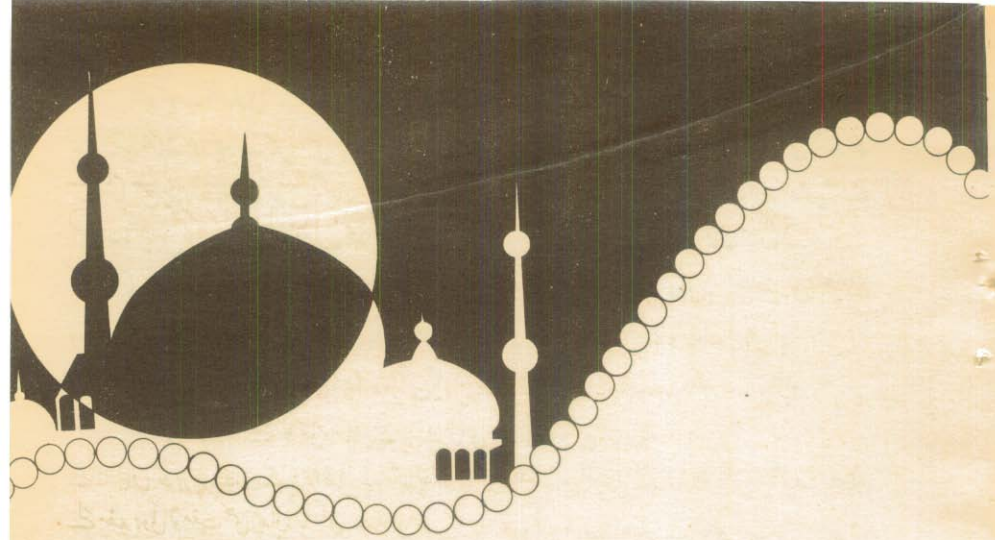

حضورؐ کے ایک محبوب صحابی

کاشف طاہر

حضرت ابو ایوب انصاریؓ بڑی عظمت والے صحابی تھے۔ آپؓ کا شمار "سابقین الاوّلین" میں کیا جاتا ہے۔ یعنی ایسے صحابہ اکرام، جنھوں نے اسلام کے اولین دور میں اسلام قبول کیا۔

آپؓ کا اصل نام خالد بن یزید تھا۔ آپؓ مدینے میں ہجرت نبویؐ سے ۳۱ سال پہلے پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں مدینہ کو یثرب کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی شہرت ہجرت کے واقعے سے ہوئی۔ جب آنحضرتؐ مکے سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو ہر انصاری کی یہ خواہش تھی کہ آپؐ کا قیام ان کے گھر ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری اونٹنی (قصبیٰ) جس جگہ رک جائے گی، میں وہیں قیام کروں گا۔ وہ اونٹنی حضرت ایوبؓ کے گھر کے سامنے جا کر رکی۔ اس طرح سرکار عالمؐ کی میزبانی کا شرف آپؓ کو حاصل ہوا۔ آنحضرتؐ تقریباً ۷ ماہ تک آپؓ کے مہمان رہے۔ جب مسجد کے ساتھ حجروں کی تعمیر مکمل ہو گئی تو حضورؐ نے مسجد نبویؐ میں قیام فرمایا۔ حضورؐ کی میزبانی کی وجہ سے صحابہ اکرام میں آپؓ کو بڑی قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ اسی بناء پر آپؓ کو "میزبان رسولؐ" کہا جاتا ہے۔

ابو ایوب انصاریؓ نے تمام غزوات میں حصہ لیا۔ آپؓ نے تمام عمر ہی جہاد میں گزاری۔ آپؓ نے ایشیا، افریقہ اور یورپ میں لڑی جانے والی جنگوں میں بھی حصہ لیا۔ آپؓ نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد بھی جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۴۰ھ میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لئے حضرت امیر معاویہؓ نے ایک بیڑا تشکیل دیا۔ آپؓ ضعیف العمری کے باوجود اس جہاد میں تقریباً چار سال تک مصروف رہے۔ آپؓ کی عمر ۷۳ برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ مگر ذوقِ جہاد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ قسطنطنیہ کی مہم کے دوران آپؓ سخت بیمار ہو گئے تھے۔ جب صحت کی امید نہ رہی تو آپؓ نے وصیت فرمائی کہ

"جب میں مر جاؤں تو میرا جنازہ دشمن کی سرزمین میں جہاں تک لے جا سکو، لے جانا اور جب آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہ رہے تو اسی جگہ مجھے دفن کر دینا۔"

۵۷ھ میں جب آپؓ انتقال فرما گئے تو آپؓ کو قسطنطنیہ کی فصیل کے سامنے دفن کیا گیا۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد حضرت ایوبؓ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ مزار کے ساتھ ایک جامع مسجد اور مدرسہ بھی بنوایا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ حافظ قرآن تھے۔ اور لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے۔ آپؓ کا شمار کاتبین وحی میں کیا جاتا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ۱۵۰ احادیث منقول ہیں۔

آپؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں مسجد نبویؐ میں امامت کی سعادت بھی حاصل کی۔ حضرت علیؓ نے آپؓ کو مدینے کا والی (گورنر) بھی مقرر کیا۔

لاکھوں درود اور سلام ہوں آنحضرتؐ پر اور سلام ہوں آپؐ کے تمام صحابہ اکرام پر۔

سات عادات

ایک روز خلیفہ ہارون الرشید نے لوگوں سے کہا۔

"اگر تم اللہ تعالیٰ کے نیک بندے بننا چاہتے ہو تو بچوں جیسے اخلاق بنالو۔"

لوگوں نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

خلیفہ نے کہا۔ "بچوں میں سات عادتیں ہوتی ہیں۔ اگر یہ عادتیں بڑوں میں ہوں تو وہ ولی اللہ بن جائیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ وہ رزق کا غم نہیں کرتے، مل کر کھاتے ہیں، لڑتے ہیں تو دل میں کینہ نہیں رکھتے، لڑائی کے بعد جلدی صلح کر لیتے ہیں، اپنے بڑوں سے ڈرتے ہیں، ذرا سی دھمکی میں رونے لگتے ہیں اور دشمنی کا جامہ مستقل نہیں پہنتے۔

حامد علی شاہد..... لاہور

کشمیر کی فریاد

سید نظر زیدی

ہر طرف اک ظلم کی آندھی چلی کشمیر میں
جاگ اے مسلماں، قیامت آگئی کشمیر میں

لے رہے ہیں جب سے گھر گھر کی تلاشی بھارتی
عدل اور انصاف کی مشعل بجھی کشمیر میں

بے گنہ، معصوم بچّے جل رہے ہیں آگ میں
زندگی کے پھول اگتے تھے کبھی کشمیر میں

وادیٔ کشمیر کے مالک مصیبت میں ہیں آج
عیش کرتے ہیں درندے بھارتی کشمیر میں

آج ہندو ڈوگرے اور بھارتی کرتے ہیں راج
پرچمِ اسلام اُڑتا تھا کبھی کشمیر میں

دے دیا ہر ظلم کو بھارت کے ہندو نے رواج
ہورہی ہے ہر بھلائی کی نفی کشمیر میں

شیر دل بانکے جواں لڑتے ہیں آزادی کی جنگ
اے خدا ہو ان کو حاصل فتح بھی کشمیر میں

فتح کا پرچم اڑے گا جلد آئے گا وہ دن
جھک نہیں سکتا ہمارا سر کبھی کشمیر میں

خوں کا مسلم کے ہر اک قطرہ بنے گا آفتاب

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف ۱۵۰ روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

آنکھ مچولی بیرون ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰ روپے

زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲/ڈی سائٹ کراچی نمبر ۱۶

فاتح کی شکست

اخگر انوار اعوان

گھنٹی بجتے ہی لڑکے امتحان گاہ سے آنا شروع ہوگئے۔ ان میں سے کچھ چہرے شاداب اور خوش نظر آرہے تھے جبکہ بعض چہروں سے مایوسی جھلک رہی تھی کہ مسئلہ سالانہ امتحانات کا تھا۔ اس امتحان میں ناکامی کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ طالب علم کا پورا ایک سال ضائع ہوگیا۔ شکیل کو کمرہ امتحان سے باہر آتا دیکھتے ہی درجہ نہم کے تمام طلباء اس کی طرف لپکے۔

"کیسا ہوا پرچہ؟" رافع نے بڑی بے تابی سے سوال کیا۔

"کیا بتاؤں یار آج تو غالب کے خطوط لے ڈوبے"۔ شکیل نے آہ بھرنے کے انداز میں جواب دیا۔

"ہاں یار۔ معلوم نہیں سر معین اتنا ظلم کیوں کرتے ہیں۔ سارے سوالات اتنے مشکل دے دیتے ہیں۔" فاروق نے لقمہ دیا "مجھے تو مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" نے بڑا پریشان کیا۔"

"اور پتا ہے میرے ساتھ کیا ہوا؟ رات بھر اقبال کی "خودی" پر مغز سوزی کرتا رہا۔ کچھ کچھ یاد بھی ہوگئی تھی لیکن وہ سر نے امتحان میں دی ہی نہیں۔ اس کی بجائے۔ حضرت میر تقی میر صاحب تشریف لے آئے اور

میرا ستیاناس کر گئے۔" عاطف غفار نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "اس دفعہ تو اردو کے پرچے میں پاس ہونا بھی مشکل نظر آتا ہے۔"

اس طرح یہ بیس بائیس ہم جماعت باتیں کرتے ہوئے کھیل کے میدان میں پہنچ گئے۔

"مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی" شکیل احمد سیمنٹ کے ایک بلاک پر برا جمان ہوتے ہوئے بولا "کہ ایسی مشکل تحریریں جو اسٹوڈنٹس کی سمجھ ہی میں نہیں آتیں داخل نصاب کرنے میں آخر کیا مصلحت کار فرما ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ بیوروکریسی کی اس پالیسی کا حصہ ہے جس کے تحت طلبہ کے لئے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

"رہ رہ کے رجب علی بیگ سُرور پر غصہ آرہا ہے۔" نعمان الہدیٰ بڑبڑائے۔ "ابو کہتے ہیں ان کے زمانے میں سرور صاحب کی تحریروں کے ذریعے طلبہ میں زبان و بیان کی قابلیت اور ادبی ذوق بڑھایا جاتا تھا۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں آج کل ان سے معصوم طلبہ کو امتحان میں فیل کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ طلبہ میں ادبی ذوق کیا خاک پیدا ہو گا۔ سُرور صاحب کی تحریروں کی چاشنی، پیرائے کی رنگینی، خیالات کی ندرت، اور مافی الضمیر کا یکساں بہاؤ معصوم طلبہ کو بالآخر پریشان کر دیتا ہے۔

"ویسے بائی دی وے۔" غفران عالم سنجیدہ شکل بنا کر بولے۔ "حضور نے یہ الفاظ کس نقاد سے کرائے پر حاصل کئے ہیں۔" محفل میں ایک قہقہہ اور بلند ہوا اور نعمان کھسیانی سی شکل بنا کر نیچے دیکھنے لگا۔

"اور پھر" حسیب ایوبی اس عارضی خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا "ان لوگوں نے خوب گزر بسر کی، پڑھا لکھا، علم و ادب کے قلعے تعمیر کئے اور دنیا سے تشریف لے گئے۔ دنیا بھی خوب گزری اور آخرت بھی اچھی گزرے گی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ لیکن آج ہمیں ان لوگوں کے حالات زندگی پڑھنے پر نہ جانے کیوں مجبور کیا جاتا ہے۔ میں پورے یقین سے یہ بات کہتا ہوں کہ شاعروں اور ادیبوں کے حالات زندگی سے طلبہ کو تقریباً اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے جتنی کہ کسی بھینس کو۔" اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

"میرا تو خیال ہے" سلمان نے گفتگو میں اپنا حصہ ادا کیا "ان شریف لوگوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ان کے مرنے کے بعد پاکستان کا محکمۂ تعلیم ان کے حالات زندگی کو جمع کرے گا اور ان پر بہت غور و خوض کرنے کے بعد انہیں نصاب تعلیم کا حصہ بنا دے گا تاکہ ہر طالب علم چار و ناچار انہیں پڑھے اور عبرت حاصل کرے۔" تمام ساتھی یہ بات سن کر ایک دفعہ پھر کھلکھلا دیئے۔

دسویں جماعت کے یاسر بھی جو اُن کے قریب سے گزر رہے تھے یہ بات سن کر مسکرا دیئے اور بولے "ویسے ہمارا محکمۂ تعلیم اور کچھ کرے نہ کرے "غور و خوض" ضرور کرتا رہتا ہے۔ بقول ابن انشاء ایک صاحب اپنے کسی کام سے دفتر تعلیم گئے اور وہاں اپنے پسندیدہ فلمی نغمات کی کاپی بھول کر آگئے۔ محکمۂ تعلیم

نے اس پر گہرے غور و خوص کے بعد اسے پرائمری کے نصاب میں داخل کر دیا۔" یاسر تو یہ بات کر کے آگے بڑھ گئے لیکن پوری نویں جماعت کو دیر تک ہنستا چھوڑ گئے۔

اگرچہ بات بات پر شگوفے پھوٹ رہے تھے لیکن ان کی گفتگو سے یہ بات بالکل عیاں تھی کہ ان میں ہر طالب علم کسی نہ کسی شاعر یا ادیب سے چڑا بیٹھا ہے۔ "آپ سب لوگوں کی باتیں بھی ٹھیک ہیں لیکن مجھے تو سب سے زیادہ مرزا غالب سے شکایت ہے۔" شکیل نے باقی ساتھیوں کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "میں نے وہ طرز تحریر ایجاد کیا ہے کہ خط کو مکالمہ بنا دیا ہے" دراصل مرزا غالب کو شاعری اور خط نویسی کے علاوہ اور کوئی مفید کام ہی نہیں تھا۔ یقین کریں اگر مرزا غالب اس زمانے میں ہوتے اور میں ان کے بزرگوں میں سے ہوتا تو انہیں پکڑ کر کمرۂ امتحان میں بٹھا دیتا اور انہیں آج کا پرچہ تھما دیتا کہ لو اور اسے حل کرو۔ اور پھر وہ ڈھائی گھنٹے تک کمرہ امتحان میں جمایاں لینے کے بعد چہرے پر سوا آٹھ بجا کر باہر نکلتے تو ان سے پوچھتا بتاؤ برخوردار آٹے دال کا کیا بھاؤ ہے....."

"آج معلوم ہوتا ہے شکیل بھائی مرزا غالب سے بڑے تپے بیٹھے ہیں۔" شجیع انصاری نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور پھر اس بات کو بھی جانے دو۔ صرف اسی ایک تضاد ہی کو لے لیجئے کہ ایک طرف تو ہمیں ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ کسی کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بد اخلاقی ہے اور دوسری طرف سر سید، غالب اور علامہ اقبال کے خطوط زبردستی پڑھوا کر ہمارا اخلاق بلند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بقول شاعر

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔

زبیر بڑی دیر سے خاموش بیٹھا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا بولا "میرا تو ایمان ہے کہ شعر و شاعری کو نصاب میں داخل کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں کیونکہ عملی زندگی میں اس کا کوئی استعمال نہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے شعروں سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ پرچے میں اکثر یہ سوال بھی آتا ہے کہ اپنی پسند کے پانچ اشعار لکھ دیں۔ میں کل ساری رات پانچ شعر یاد کرتا رہا کمرہ امتحان میں پہنچ کر ان میں سے بھی تین بھول گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، جج، صحافی، سیاستدان، تاجر، فوجی افسر..... ان میں سے کونسا عہدہ ہے جسے حاصل کرنے کے لئے شاعری پڑھنا ضروری ہے۔؟"

"کیوں نہ ایسا کیا جائے۔" رافع مبین نے سب کی باتیں سننے کے بعد تجویز پیش کی "کہ مشکل تحریروں کے خلاف باقاعدہ ایک تحریک چلا کر حکومت تک اپنی بات پہنچائی جائے؟"

"یہ ٹھیک ہے۔" غفران جوہر تخریبی کام میں پیش پیش رہتے ہیں بولے "اور باقاعدہ جلوس نکالا جائے جو ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفس پر پہنچ کر اردو نصاب کے خلاف نعرے لگائے جائیں۔"

"بس بس، رہنے دو اپنے اس منصوبے کو۔" شکیل نے فوراً اس کی بات کاٹی "کیا اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا ؤ گے؟۔ تمہارا تو نام پہلے بھی پانچ چھ دفعہ کٹ چکا ہے۔"

"پھر تم ہی بتادو کیا کرنا ہے۔" غفران بے چارہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔
"اپنی بات سلیقے کے ساتھ اوپر تک پہنچائی جائے"۔ شکیل بولے۔
"ہاں میرا خیال ہے آج کی اس گفتگو کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک دردمندانہ اپیل تیار کی جائے اور پرنسپل صاحب تک پہنچائی جائے تاکہ وہ اسے آگے بڑھائیں۔" نعمان الہدیٰ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔
"بات تو معقول ہے۔" رافع نے ہاں میں ہاں ملائی "لیکن میرے خیال اپیل وپیل کی بجائے آج کی پوری گفتگو کا خلاصہ تیار کیا جائے۔ کیونکہ اس میں قدرے تفصیل کے ساتھ اپنی بات پیش کی جاسکتی ہے۔"
تجویز کی تائید تمام ساتھیوں نے کی۔ طے ہوا کہ شکیل بھائی ایک مضمون کی شکل میں تمام باتوں کو جمع کریں گے جسے ایک وفد کی شکل میں پرنسپل صاحب کو پیش کیا جائے گا۔
"یار کیوں نہ اس مضمون کو سالانہ مجلّے میں چھپوایا جائے" شکیل نے تجویز میں ترمیم پیش کی "اتفاق سے اسکول کا سالانہ مجلّہ تیاری کے مراحل میں ہے۔ اس میں اگر ہمارا یہ مضمون چھپ جائے تو صرف پرنسپل صاحب، اساتذہ اکرام اور دوسرے طلبہ اسے پڑھیں گے بلکہ ہماری بات محکمۂ تعلیم کے افسران تک براہ راست پہنچ جائے گی کیونکہ مجلّے کی اعزازی کاپیاں تمام افسران کو بھیجی جاتی ہیں۔"
تجویز مثبت ہو اور وہ شکیل بھائی کی طرف سے آئی ہو تو کون تھا جو اس کی مخالفت کرتا۔ سب نے بیک زبان تجویز کی حمایت کی۔ طے یہ ہوا کہ مضمون کو تحریر کرنے اور چھپوانے کا کار خیر شکیل بھائی ہی سرانجام دیں گے، رافع، فاروق، نعمان اور حبیب ان کی معاونت کریں گے۔

○○

آج نہ صرف اسکول کا سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات ہے بلکہ سالانہ مجلّے کی تقریب رونمائی بھی ہے۔ پنڈال میں زبردست گہما گہمی ہے جہاں تمام جماعتوں کے طلبہ مل جل کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن درجہ نہم کے تمام طلبہ ایک ٹولی کی شکل میں اسٹیج کے قریب بیٹھے ہیں مہمان خصوصی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تجمل علی صاحب تشریف لانے ہی والے ہیں لیکن نویں جماعت کی کوشش یہ ہے کہ ان کے آنے سے پہلے پہلے کسی طرح ناظم جلسہ سراختر حسین قریشی کو قائل کرلیا جائے کہ نہم کلاس کے ایک نمائندے کو اسٹیج پر آکر اردو نصاب کے بارے میں اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ ایک وفد ان سے بات کر رہا ہے لیکن اختر صاحب کو اس مطالبے میں کوئی معقولیت نظر نہیں آرہی۔ اونٹ ابھی کسی کروٹ بیٹھا نہیں کہ مہمان خصوصی تشریف لے آئے اور اختر صاحب ان سب کو پنڈال میں جانے کا اشارہ کرکے خود ان کے استقبال کے لئے اسکول کے گیٹ کی طرف چلے گئے ہیں۔
آخر تقریب شروع ہوئی، انعامات تقسیم ہوئے، مجلّہ کی رونمائی ہوئی لیکن نویں جماعت کے لڑکے ان سب

چیزوں میں دلچسپی لینے کے بجائے ابھی تک انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے ایک نمائندے کو اسٹیج پر بلایا جائے گا۔

سالانہ مجلّے میں سے بہترین تحریر کا انتخاب کرنے والی کمیٹی نے اپنا فیصلہ تحریری شکل میں اسٹیج سیکریٹری تک پہنچا دیا ہے۔ طلبہ کی اکثریت کا خیال ہے کہ آٹھویں کلاس کے سوحیب محمود یا عمیر احمد کی تحریر سب سے اچھی ہوگی جب کہ دسویں جماعت کے بچے پرامید ہیں کہ ان کی جماعت کے یوسف یا محمد یاسر اس انعام کے حقدار قرار پائیں گے۔ غرض ہر جماعت اسی قسم کی کسی نہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ لیکن نویں جماعت کے سر پر ایک ہی بھوت سوار ہے کہ انہیں کسی طرح یہ موقع مل جائے کہ ان کا کوئی نمائندہ اسٹیج پر جا کر اردو نصاب کی خامیاں گنوا سکے۔

اگرچہ اختر صاحب جو میگزین انچارج بھی ہیں اس وقت بہترین تحریر کے نام کا اعلان کرنے کے لئے اسٹیج پر تشریف لا رہے ہیں لیکن نویں جماعت اب بھی پرامید ہے کہ وہ اعلان سے پہلے شکیل بھائی کو اسٹیج پر آکر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ضرور دیں گے۔ لیکن اختر صاحب نے بسم اللہ کے فوراً بعد بہترین تحریر کا اعلان کر دیا۔ "کمیٹی کے فیصلے کے مطابق اس سال سالانہ میگزین میں چھپنے والی بہترین تحریر "نویں جماعت اور اردو کا نصاب" قرار پائی ہے۔ اسے نویں جماعت کے شکیل احمد نے تحریر کیا ہے۔ کمیٹی نے اپنے فیصلے میں تحریر کے خالق کی قوت مشاہدہ، انداز تحریر اور قدرت بیان کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ غالب، سرسید، رجب علی بیگ سُرور، اقبال، حالی اور آزاد جیسے بڑے ادیبوں کا لکھا ہوا ادب پڑھے بغیر کسی کا انداز تحریر اتنا عمدہ نہیں ہو سکتا....."

اختر صاحب نے آخر میں نویں کلاس کے کسی نمائندے کو اسٹیج پر آکر اردو نصاب کے بارے میں طلبہ کی آواز مہمان خصوصی تک پہنچانے کی دعوت دی ہے۔ لیکن نویں جماعت کے تمام طلبہ جو کچھ دیر پہلے تک شدت سے اس اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔ اب نیچے کی طرف سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں اب ان میں سے کوئی بھی اسٹیج پر جانے کے لئے تیار نہیں ہے..... نہ جانے کیوں ؟؟؟

حفاظت

باپ ..... بیٹا تم کتاب کی جلد کو صابن سے کیوں دھو رہے ہو۔

بیٹا! ..... "اس لئے کہ صابن جلد کی حفاظت کرتا ہے آپ نے ٹی وی پر نہیں سنا"۔

(طاہر ارشاد ..... بہاولنگر)

نام درست کیجئے

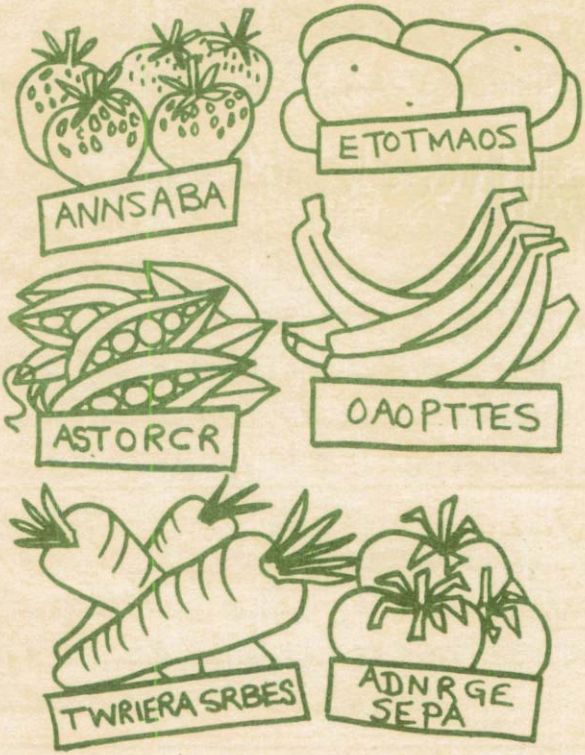

پھلوں اور سبزیوں کے انگریزی ناموں کی نہ صرف جے غلط ہوگئی ہے بلکہ یہ بے ترتیب بھی ہوگئے ہیں۔ آپ اصلاح کر دیجئے۔ اگر کر سکیں۔

سُرخ موت

ترجمہ: آصف فرخی

مشہور فرانسیسی ادیب ایڈ گرایلن پو دنیا کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ افسانے کے فن میں پو کا مقام بہت بلند ہے، انہوں نے دنیا کے بے شمار لکھنے والوں کو متاثر کیا۔ اس شمارے میں ہم ان کی ایک پراسرار کہانی شائع کر رہے ہیں۔ یہ کہانی آپ کو کیسی لگی؟ اس کے بارے میں ہمیں بتانا نہ بھولئے گا۔

(ادارہ)

سارے دیس پر سرخ موت کا سایہ تھا۔ سرخ موت شہر شہر گلی گلی گھوم رہی تھی۔ کوئی اس سے محفوظ نہ تھا۔ کسی قاتل کی کبھی ایسی دہشت نہ چھائی ہوگی، نہ کوئی جلاد ایسا سفاک ہوا ہوگا۔

سرخ موت آناً فاناً وار کرتی، اچانک اور ناگہانی۔ اس کا شکار ہونے والوں کے تیز درد اٹھتا اور چکر آنے لگتے۔ اور اس کے بعد پھر وہ ہول ناک علامت ظاہر ہوتی جس کی وجہ سے اس وبا کا نام "سرخ موت" رکھا گیا تھا۔ اس کا شکار ہونے والوں کا خون رسنے لگتا۔ بڑی بھیانک کیفیت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا

کہ سارے بدن کی کھال میں سوراخ ہوگئے ہیں اور خون ایک ایک مسام سے بہا جارہا ہے۔ یہ دیکھنے کی تاب لانا بھی ممکن نہیں تھا کہ تڑپتے ہوئے لوگ فرش پر ڈھیر ہو جاتے اور اذیت کی شدت کے مارے چیخنے لگتے۔ آدھے گھنٹے کے اندر ان کا سانس اکھڑ جاتا اور ان کا دم نکل جاتا۔ مرنے والوں کے چہرے خون سے سرخ ہوتے، کیوں کہ یہی سرخ موت کا نشان تھا۔

کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا علاج کیسے کیا جائے۔ اور کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ اگلا وار کہاں اور کس پر کرے گی۔ لوگ ہر وقت اس کے خوف اور مستقل عذاب میں رہتے۔

لیکن ایک جی دار ایسا بھی تھا جس کو سرخ موت کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ اس کا نام تھا شہزادہ پروسپرو۔ دولت مند اور سیر و تفریح کا دلدادہ شہزادہ اپنی عیش و عشرت کی زندگی کے معمولات کو اسی طرح جاری رکھے رہا اور چاروں طرف لوگ موت کا لقمہ بنے جارہے تھے۔ شہزادے کو تو جیسے خبر ہی نہیں تھی۔

سرخ موت لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارے چلی جارہی تھی۔ آخر کار شہزادے کو بھی اندازہ ہوگیا کہ اس کے آدھے سے زیادہ نوکر چاکر، خدمت گار مرچکے ہیں اور اس کے بہت سے دوست بھی اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔

لیکن خوف یا غم کا اظہار کرنے کے بجائے، شہزادے نے اس خبر کو سن کر بھی اپنے مخصوص انداز میں یوں ہی ٹال دیا۔ "میں بڑی بھاری دعوت رچاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "چھ مہینے جاری رہنے والی دعوت، جس میں ہم سب اس بے کار کی مصیبت کو بھول جائیں گے۔"

لہٰذا شہزادے پروسپرو نے دربار کے امراء اور رؤسا اور ان کی بیگمات کو بلاوے بھیجے۔ "ہم اس اداس اور سوگوار شہر سے باہر نکل جائیں گے" اس نے کہا۔ "گاؤں میں میرا محل ہے۔ ہم وہاں کا رخ کریں گے۔"

دربار کے اُمراء و رؤسا کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ شہزادے کے پیچھے پیچھے اس محل میں چلے جائیں جو سب سے الگ تھلگ ایک دور اُفتادہ علاقے میں واقع تھا۔ سب کو خیال تھا کہ وہاں پہنچ کر وہ سرخ موت کے خطرے سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اور اس کو بھول جائیں گے۔

شہزادے کا محل بہت شان دار تھا۔ اونچا، پر شکوہ اور قدیم۔ لیکن آس پاس کی ویرانی کی وجہ سے بالکل سنسان معلوم ہوتا۔ اس کے چاروں طرف مضبوط اور اونچی فصیل کھنچی ہوئی تھی جن میں لوہے کے پھاٹک تھے۔ جب تمام مہمان محل کی فصیل کے اندر داخل ہوگئے تو شہزادے نے حکم دیا کہ پھاٹک بند کر دیئے جائیں اور ان پر قفل چڑھا دیئے جائیں۔ "اب سرخ موت یہاں داخل نہیں ہو سکتی۔" اس نے

ہنس کر کہا۔ "باقی دنیا اس سے نمٹتی رہے!" اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تائید کی۔ پھاٹکوں پر قفل چڑھا دئے گئے اور فصیل کو بند کر دیا گیا۔

محل کے اندر شہزادے نے بہت دن تک رہنے کا سامان مہیا کیا ہوا تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں افراط سے تھیں۔ نوکر چاکر بہت تھے کہ مہمانوں کی معمولی سے معمولی ضرورت کا خیال رکھیں۔ موسیقار موجود تھے کہ سبھا سجا سکیں اور ماہر کلاونت کہ روز شام کو محفل گرم رہے۔ پڑھنے کے لئے کتابیں تھیں اور مسخرے موجود تھے کہ لوگوں کو ہنساتے رہیں۔ اور کس چیز کی کمی تھی؟ سب کا خیال تھا کہ جب تک کہ وبا کا زور ٹوٹ نہیں جاتا، وقت گزارنے کا اس سے بہتر طریقہ نہیں ہو سکتا، اور نہ اس سے بہتر کوئی جگہ ہو سکتی ہے۔ یہاں محل کی اونچی فصیل کے اندر ہر شخص خوش تھا، مطمئن اور محفوظ تھا۔

یہ دعوت چھ مہینے تک چلتی رہی۔ گاہے بگاہے شہزادے کو اطلاع ملتی رہتی کہ سرخ موت سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے، سرخ موت کا قہر اور بڑھ گیا ہے۔ لیکن ایسی کوئی خبر محل کے اندر مہمانوں کے رنگ میں بھنگ نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ کھانے پینے، مزے اڑانے میں دن بھر مشغول رہتے۔

ان کو تکلیف تھی تو بس اتنی کہ حد سے زیادہ تفریح سے بھی اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ ان کو بے زاری سے بچانے کے لئے شہزادے نے ایک اور دلچسپی کا ڈول ڈالا۔ اس نے اپنے مہمانوں سے کہا کہ ہم نقاب پوش رقص کا اہتمام کریں گے۔ ہم بہت بڑے پیمانے پر ایسے رقص کی محفل سجائیں گے جس میں تمام مہمان بھیس بدل کر اور بہروپ بھر کر آئیں گے اور محل کے سارے مہمان اس میں شریک ہوں گے۔

محل کے مہمانوں میں اس خبر سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دربار کے امیر اور رئیس اور ان کی بیگمات بڑے جوش و خروش سے یہ طے کرنے میں جٹ گئے کہ وہ کون سا سوانگ بھریں گے اور کس بھیس میں جائیں گے۔ خوب تیاریاں ہونے لگیں۔

آخر کار وہ دن آ گیا جب نقاب پوش رقص ہونا تھا۔ محل کے پرانے حصے میں سات وسیع و عریض رقص گاہیں تھیں۔ شہزادے نے فیصلہ کیا کہ رقص کا اہتمام ان ہی میں کیا جائے۔ رقص کے لئے استعمال ہونے والے یہ سات کمرے ایک کے بعد ایک واقع تھے اور ان کی اونچی لمبی کھڑکیاں آس پاس کے دیہات کی طرف نہیں کھلتی تھیں بلکہ ایک اور راہداری پر کھلتی تھیں جس کو بند کر دیا گیا تھا۔ کمروں میں روشنی کے لئے دیوار میں مشعلیں لگی ہوئی تھیں۔ جب مشعلیں جل اٹھتیں تو ان کے بھڑکتے شعلوں کی وجہ سے ایک عجیب سا تاثر پیدا ہو جاتا۔

ہر کمرے کے در و دیوار ایک الگ رنگ کے تھے، اور اسی رنگ کے پردے اور دیوار گیر تصویریں

مزین تھیں۔ پہلا کمرہ نیلا تھا، دوسرا کمرہ عنابی، تیسرا سبز، چوتھا نارنجی، پانچواں سفید اور چھٹا کاسنی۔ ہر کمرے کی اونچی اونچی پتلی پتلی کھڑکیوں میں رنگین شیشے جڑے ہوئے تھے، جن کا رنگ دیواروں کے رنگ جیسا تھا۔

"کمروں کو اس طرح سے سجانا بھی کیسی عجیب بات ہے۔" ایک خاتون نے کہا۔ "شہزادے کا ذوق بہت غیر معمولی ہے!"

لیکن ساتواں کمرہ ایسا تھا کہ سارے مہمانوں کو سب سے زیادہ عجیب معلوم ہوتا تھا۔ اس کمرے کی دیواریں سیاہ پوش نظر آتی تھیں۔ دبیز سیاہ مخمل کی طویل دیوار گیر تصویریں فرش تک آتی تھیں، جہاں سیاہ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ یہ واحد کمرہ تھا جہاں کھڑکیوں کا رنگ کمرے کی دیواروں جیسا سیاہ نہیں تھا۔ سیاہ رنگ کے بجائے ساری کھڑکیوں کا رنگ سرخ تھا، اتنا سرخ جیسے خون۔

اس ساتویں کمرے میں ایک اور عجیب چیز تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ دیو قامت گھڑیال تھا جو آبنوس کا بنا ہوا تھا۔ اس کا پینڈولم سونے کا بنا ہوا تھا، اور آگے پیچھے حرکت کرتا ہوا لمحوں کا حساب رکھتا۔ لیکن جب گھنٹہ پورا ہو جاتا تو اس میں سے ایسی آواز آتی کہ رقص کرنے والے تمام لوگ تھم جاتے، ان کے چہرے فق ہو جاتے۔ موسیقار اپنے ہاتھوں میں وائلن تھامے رہ جاتے اور چور نظروں سے ایک دوسرے کی طرف تکنے لگتے۔ وہ دل ہی دل میں قسم کھاتے کہ اگلا گھنٹہ پورا ہو گا تو وہ خوف زدہ نہیں ہوں گے۔ لیکن ہر مرتبہ ایسا ہوتا کہ گھنٹہ بجنے کا وقت جوں جوں قریب آنے لگتا، انکے دل ایک بار پھر سہم جاتے۔

لیکن اس عجیب، اندھیرے ساتویں کمرے اور اس بھیانک آواز والے گجر کے باوجود، رقص گاہوں میں جیسے میلہ لگا ہوا تھا۔ جشن کا سماں تھا۔ لوگ نت نئے بھیس بدل کر اور زرق برق پوشاکیں پہن کر آئے تھے، اور مشعلوں کی روشنی میں رقص گاہ کے فرش پر ایسے حرکت کر رہے تھے جیسے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔ خوشی سے بھرے قہقہوں اور دلچسپ گفتگو کی آوازوں سے چھ کمرے بھرے ہوئے تھے۔ مگر جو بھی مہمان ساتویں کمرے کو ایک نظر دیکھ لیتا، دوبارہ اس طرف کا رخ بھی نہ کرتا۔

شہزادہ پروسپرو اس محفل میں سب سے زیادہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ہر شخص سے زیادہ خوش ہے۔ اس کا تو انداز ہی یہی تھا۔ "سب ٹھیک تو ہے ناں؟" وہ ایک ایک مہمان کے پاس جا کر پوچھتا۔ "آپ کچھ کھانا پسند کریں گے؟" وہ مہمانوں کی تواضع کر رہا تھا اور ہر طرف نظر آ رہا تھا۔ نقاب پوش رقص واقعی بہت کامیاب جا رہا تھا۔ کئی برس سے ایسی بارونق تقریب نہ ہوئی تھی۔

خوشی کے موقعوں پر وقت تو جیسے ٹھہرتا ہی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پر لگا کر اڑ گیا۔ چنانچہ اس محفل کے مہمان بھی حیران رہ گئے جب ساتویں کمرے کا عجیب و غریب گجر آدھی رات کی صدا دینے لگا۔

گجر کی آواز پہلے سے بھی زیادہ ہولناک تھی۔ ایک، دو، تین، چار ..... چوتھی آواز پر موسیقار نے ساز روک دیئے، مہمان دم بخود کھڑے اسکی آواز سن رہے تھے ..... پانچ، چھ، سات ..... گجر کی آواز ساتویں کمرے سے نکل کر سارے محل میں پھیلتی جارہی تھی۔ سب لوگ ساکت کھڑے تھے۔ یا شاید اس وجہ سے چاروں طرف سناٹا تھا، لیکن وجہ کوئی بھی ہو، گجر پورے بارہ بجا چکا تھا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر اچانک پہلے کمرے سے حیرت کی آواز بلند ہوئی اور دبی دبی سرگوشیاں پھیلنے لگیں۔ حیرت کی وجہ یہ تھی کہ رقص گاہ کے عین بیچوں بیچ، فرش پر ایک نقاب پوش موجود تھا جسے اس سے پہلے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور جیسے جیسے مہمان اس کی طرف متوجہ ہوتے گئے ان کی حیرت خوف میں بدلتی گئی۔ جس کی بھی نظر اس پر پڑ جاتی، اس کے حلق سے خوف کی گھٹی گھٹی چیخ نکل جاتی۔

شہزادے نے اپنے مہمانوں سے یہ تو کہا تھا کہ نت نئے بہروپ بھریں اور عجیب و غریب پوشاکیں پہن کر آئیں ..... جو خوبصورت ہوں یا عجیب یا مزاحیہ مگر یہ ..... یہ تو حد ہوگئی! اس کا تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے!

وہ لمبا تڑنگا نقاب پوش رقص گاہ کے فرش کے بیچوں بیچ اکیلا کھڑا تھا اور اس کے کاندھوں پر سرمئی رنگ کا لبادہ تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر جو نقاب پہن رکھا تھا وہ کسی لاش کے جیسا تھا، گویا وہ اپنی قبر سے ابھی ابھی اٹھ کر آیا ہو۔ شاید یہ لبادہ اور نقاب بھی اس محفل کے مہمان یہ سمجھ کر برداشت کر لیتے کہ جو مہمان اس نقاب کو اوڑھے ہوئے ہے اس کا مذاق ذرا سنگین ہے، مگر اس نقاب میں ایک بات بہت عجیب تھی۔ اس لاش کے نقاب پر سرخ سرخ نشان تھے ..... جیتے جیتے لہو کے نشان، سرخ موت کے نشان!

شہزادہ پروسپرو دوسرے کمرے میں تھا، وہ اس کمرے میں آگیا کہ اس اچانک خاموشی کا سبب معلوم کرے۔ جب اس نے نقاب پوش کو دیکھا تو وہ غصے سے بھر گیا۔ "کون گستاخ ہے جو اس طرح میری اور میرے مہمانوں کی توہین کر رہا ہے؟" وہ دھاڑا۔ "کون بدبخت ہے جو میرے محل میں ایسی بدشگونی کر رہا ہے؟"

پھر شہزادے نے مڑ کر مہمانوں کی طرف دیکھا۔ "پکڑ لو اسے!" اس نے چیخ کر کہا۔ "اس کے چہرے سے نقاب نوچ ڈالو، اسے اس کے جرم کی پاداش میں پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا!"

ایک آدھ مہمان آگے بڑھا مگر وہ نقاب پوش خود دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ اس جانب جہاں شہزادہ کھڑا تھا۔ جو مہمان اس کو روکنے کے لئے آگے بڑھا وہ دو چار قدم آگے بڑھ کر خود ہی رک گیا اس کے قدم من من بھر کے ہوگئے اور وہ خوف کے عالم میں ساکت ہوگیا۔ کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ اس کو روک سکے اور وہ نقاب پوش بغیر کسی روک ٹوک کے، ایک سے دوسری رقص گاہ میں گزرتا گیا اور

ساتویں کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔

شہزادہ پروسپرو اب اپنی حیرت پر قابو پا چکا تھا اس نے اپنا خنجر نکال لیا اور غصے سے بھرا ہوا اس کی جانب بڑھا۔

شہزادہ جب نقاب پوش کی طرف آیا تو نقاب پوش نے اپنے چہرے کا رخ اس کی جانب کر دیا۔ مہمانوں نے ایک چیخ سنی..... طویل اور تکلیف دہ چیخ۔ خنجر شہزادے کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اور خنجر کے ساتھ ہی شہزادہ بھی فرش پر گر پڑا۔ اس کا جسم بے جان تھا اور اس کے چہرے پر خون کے سرخ نشان تھے۔

چند لمحوں تک تو سارے مہمانوں پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ کسی نے حرکت نہ کی۔ پھر دو ایک باہمت لوگ ذرا چونکے اور سیاہ کمرے کی طرف لپکے۔ وہ بن بلایا اور ہولناک مہمان گجر کے عین سامنے کھڑا تھا۔ ایک شخص نے اس کا لبادہ گھسیٹ لیا اور اس کا نقاب نوچ ڈالا۔

کسی کے منہ سے ایک آواز نہ نکلی۔ کسی کی پلک تک نہ جھپکی۔ اس لئے کہ اس لبادے اور اس نقاب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں۔ خالی لبادہ اور نقاب سیاہ فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

ایک ایک کر کے مہمانوں پر حقیقت عیاں ہوئی اور وہ خوف کے مارے کچھ کہہ بھی نہ سکے۔ موسیقاروں اور ملازموں کو بھی احساس ہو گیا۔ کسی لٹیرے کی طرح دبے پاؤں سرخ موت وہاں پہنچ گئی تھی۔ محل کی اونچی اونچی فصیلیں اس کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ وہ اس نقاب پوش رقص میں بن بلائے مہمان کی طرح شریک تھی۔

اور پھر موت نے اپنا رقص شروع کر دیا۔ وہ جہاں جہاں سے گزری تھی، لوگ درد کی شدت سے چیختے ہوئے فرش پر گرنے لگے۔ آدھے گھنٹے کے اندر رقص گاہوں کا فرش جو موسیقی اور مہمانوں کے بے فکر قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ موت کا بازار بن کر لاشوں سے پٹ گیا۔ لاشوں کے چہروں سے خون بہہ رہا تھا۔

جب اس محفل کا آخری مہمان بھی موت کا شکار ہو گیا تو وہ آبنوسی گجر چلتے چلتے رک گیا۔ محل کی دیواروں پر جلنے والی مشعلیں زور سے بھڑکیں اور بجھ گئیں

اب چاروں طرف اندھیرا تھا اور تباہی اور سرخ موت کا راج۔

اطمینان

باپ (بیٹے سے) تم نے ماچس خریدتے وقت دیکھ لیا تھا نا؟

بیٹا۔ ہاں ابو جی میں نے ایک ایک تیلی جلا کر دیکھ لی تھی سب ٹھیک ہیں!

عائشہ رانا قصور

خواہش

عطار حسین ملک

نام تو اس کا برکت تھا۔ لیکن سب چھوٹے بڑے اسے چاچا کہہ کر پکارتے تھے۔ آج وہ بہت خوش تھا، بہت زیادہ خوش۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آج اس کی زندگی کا خوشگوار ترین دن ہو۔ اس کا چہرہ ایک انجانی مسرت سے دمک رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک کھلی کھلی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنے پوتے ارشد کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ننھا ارشد ہی بھری دنیا میں اس کا واحد سہارا تھا اس کے بڑھاپے کا دوست اور اس کے پیارے بیٹے اکرم کی آخری نشانی۔

چاچا کی کہانی بھی عجیب تھی۔ وہ بتایا کرتا تھا کہ اس نے پنجاب کے ایک خوشحال زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی اس کا باپ اپنے علاقے کا ایک بااثر زمیندار تھا لیکن بہت سی بری عادتوں میں مبتلا تھا۔ وہ شراب نوشی اور جوئے کا رسیا تھا، رفتہ رفتہ اس کی سب زمینیں، جانور اور حد یہ کہ آبائی حویلی تک داؤ پر لگ گئی اور

اسے اپنے گھر سے اپنے بال بچوں سمیت بے دخل ہونا پڑا

وہ خاندان جو علاقے میں سب سے زیادہ باعزت تھا برکت کے باپ کی بُری عادتوں کے طفیل اپنی حویلی سے نکل کر ایک کچے جھونپڑے میں پہنچ گیا۔ حالات کی خرابی نے چاچا کے باپ کو چڑچڑا اور بد مزاج بنا دیا تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ کسی جواری کے ہاتھوں جھگڑے میں مارا گیا۔

چاچا ان دنوں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ جب کچھ بھی نہ رہا تب بھی اس کے شوق نے اسے تعلیم سے جدا نہ ہونے دیا لیکن جب باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تو چاچا کو تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور وہ ان ہی زمینوں پر جن کا وہ کبھی مالک ہوا کرتا تھا معمولی مزارعوں کی طرح کام کرنے لگا تاکہ اپنے گھر کا خرچ چلا سکے۔

حالات نے اگرچہ چاچا کو تعلیم سے دور رکھا۔ لیکن اس نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا وہ دن بھر سخت مشقت کرتا اور رات کو لالٹین کی روشنی میں اپنے چھوٹے بھائیوں کو پڑھایا کرتا۔ چاچا کی محنت رنگ لائی رحمت اور حشمت دونوں نے میٹرک گاؤں کے اسکول سے پاس کر لیا تو چاچا نے انہیں مزید تعلیم حاصل کرنے شہر بھیج دیا۔ رحمت اور حشمت دونوں محنت سے پڑھتے رہے اور چاچا ان کی پڑھائی کا خرچ بھیجتا رہا۔ تعلیم مکمل ہونے پر دونوں بھائیوں نے شہر کو ہی اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ انہوں نے چاچا برکت کو بھی شہر آنے کی دعوت دی لیکن چاچا چھوٹے بھائیوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ ماں نے بھی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔

پھر رحمت اور حشمت شہر کی رنگینوں میں ایسے گم ہوئے کہ اپنے عظیم بھائی اور پیاری ماں تک کو بھول گئے۔ ماں کے دل میں بیٹوں کے لئے بڑے ارمان تھے۔ اس نے چاچا کی شادی اپنی بہن کی لڑکی سے کر دی۔

اکرم چاچا برکت کا اکلوتا بیٹا تھا اور ماں باپ اور دادی کی آنکھوں کا تارا..... ابھی اکرم پانچ چھ سال کا ہی تھا کہ اس کی دادی اور ماں چند دن کے فرق سے بخار کی وبا کا شکار ہو کر اللہ میاں کو پیاری ہو گئیں

اب چاچا ہی اکرم کے لئے ماں بھی تھا اور باپ بھی اور اس نے واقعی اپنے بیٹے کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

دن بھر محنت کرنے کے بعد چاچا اکرم کو بازوؤں میں بھر کر پیار کرتا تو سارے دن کی تھکن اتر جاتی اس کی ہر خوشی اکرم کے دم سے تھی۔

اکرم بہت ذہین تھا۔ چاچا کی دلی خواہش تھی کہ اکرم بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے جب وہ بیٹے کی پیشانی چوم کر کہتا کہ میرا بیٹا ڈاکٹر بنے گا تو اکرم اپنے معصوم لہجے میں جواب دیتا اور میں اپنے گاؤں کے سب لوگوں کا

مفت علاج کروں گا تاکہ آئندہ گاؤں میں کوئی بھی وبا نہ پھیل سکے۔

وقت کا پہیہ دھیرے دھیرے گھومتا رہا اکرم جوان اور چاچا بوڑھا ہو گیا اکرم شہر کے میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا چاچا کی خواہش کا وقت آ گیا تھا اس خواہش کے پورا ہونے کے لئے اس نے کتنی محنت کی تھی۔ یہ وہی جانتا تھا۔

چاچا کو جس دن اکرم کے ڈاکٹر بننے کی خوشخبری ملی اس کے ساتھ ہی ایک خبر ایسی بھی تھی جسے سن کر چاچا کا دل ٹوٹ گیا۔ اکرم نے لکھا تھا "ابا جان میں نے یہاں اپنی کلاس فیلو سے شادی کر لی ہے۔" اس دن چاچا نے بڑے کرب سے سوچا تھا یہ شہر جا کر لوگوں کا خون اتنا سفید کیوں ہو جاتا ہے۔ بوڑھے باپ کو اطلاع بھی نہ دی اور شادی کر لی لیکن چاچا بیٹے کی خوشی میں خوش تھا اس نے اکرم کو دعاؤں بھرا خط لکھا اور کہا کہ بیٹا اب واپس آ جاؤ تاکہ اپنے گاؤں کے غریب لوگوں کا علاج کر سکو لیکن اکرم کو اپنا مستقبل بنانے کے لئے شہر میں رہنا تھا وہ گاؤں جا کر اپنا مستقبل تباہ نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس نے چاچا کو جواب دیا کہ وہ فی الحال واپس گاؤں نہیں آ سکتا جب تک وہ شہر میں کام کر کے کچھ پیسے نہ کما لے اور معاشرے میں ایک بلند مقام نہ حاصل کر لے۔ چاچا ایک بار پھر قسمت کے آگے ہتھیار ڈال کر خاموش ہو گیا۔ ایک سال بعد اسے اطلاع ملی کہ اکرم ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہے۔ اس کا دل پوتے کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔ وہ اس پوتے، سے ملنے کے لئے شہر پہنچ گیا۔

اکرم نے گرمجوشی سے اپنے باپ کا استقبال کیا لیکن اس کی شہری بیوی گاؤں کے اس سیدھے سادھے بوڑھے کو اپنے سسر کی عزت نہ دے سکی چنانچہ کچھ دن وہاں رہ کر چاچا واپس گاؤں آ گیا۔ شہر سے واپس آ کر اس کا دل بجھ سا گیا تھا اب اس کا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا یا پھر وہ تنہا بیٹھا حقہ گڑ گڑایا کرتا اور اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا۔ پھر ایک دن شہر سے ایک بہت بری خبر آئی۔ اکرم اور اس کی بیوی ایک حادثے میں موت کا شکار ہو گئے تھے ننھا ارشد اگرچہ زندہ بچ گیا تھا لیکن اس حادثے میں اس کی قوت گویائی جاتی رہی تھی۔ چاچا فوراً شہر پہنچ گیا۔ جوان بیٹے کی موت کا صدمہ اٹھائے چاچا نے گونگے پوتے کے ساتھ زندگی کا نئے سرے سے آغاز کیا۔ ڈاکٹروں نے اسے بتایا تھا کہ ارشد کی گویائی واپس آ سکتی ہے مگر اس کے لئے ایک بڑا آپریشن ہو گا اور بڑے آپریشن کے لئے بہت سے پیسوں کی ضرورت ہو گی اور پیسہ چاچا کے پاس کہاں تھا چنانچہ وہ پوتے کو زبان دلانے کے لئے ایک بار پھر میدان عمل میں کود پڑا اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ کام کرتا اس کے سر پر بس ایک دھن سوار تھی کہ کسی طرح اتنا پیسہ جمع ہو جائے کہ ارشد کا آپریشن ہو سکے۔ رات کو وہ ارشد کو اچھی اچھی کہانیاں سناتا اور اس کے خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا اور اسے ہنسانے کے لئے طرح طرح کی مضحکہ خیز شکلیں بناتا ننھا ارشد جواب میں کھلکھلا کر ہنستا اور کچھ کہنے کی کوشش کرتا لیکن بول نہ پاتا اس وقت چاچا برکت پر پیسہ کمانے کی دھن شدت سے سوار ہو جاتی۔

آخر چاچا کی محنت رنگ لائی اور وہ اتنا روپیہ جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ ارشد کا آپریشن ہو سکے۔ چنانچہ وہ پوتے کو لے کر کراچی آگیا۔

ڈاکٹروں نے ابتدائی معائنے کے بعد ارشد کو اسپتال میں داخل کر لیا اور پھر کچھ دن بعد ارشد کا کامیاب آپریشن کیا گیا۔

آج ارشد کی پٹی کھلنے والی تھی ڈاکٹروں کو پوری امید تھی کہ پٹی کھلنے کے بعد ارشد بولنے کے قابل ہو جائے گا اور اسی لئے آج چاچا بے انتہا خوش تھا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے والی تھی۔ آج ننھا ارشد اسے دادا کہہ کر پکارے گا کتنا خوشگوار ہو گا وہ لمحہ۔

اس وقت چاچا کی بس صدر سے گزر رہی تھی۔ چاروں طرف رونق ہی رونق تھی۔ رنگ برنگے لوگ ہر طرف گھوم پھر رہے تھے۔ یکایک ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ چاچا کی نظروں میں دنیا گھوم سی گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی دھماکے اور ہوئے ہر طرف خون ہی خون پھیل گیا۔ لاشوں کے ٹکڑے فضا میں اڑنے لگے۔ ہر طرف سائرن کا شور گونج رہا تھا مگر چاچا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا اور ذہن میں سناٹا۔ جب چاچا کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ چاروں طرف ڈاکٹر اور نرسیں آجا رہی تھی اچانک چاچا کو ننھا ارشد نظر آیا، وہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ اور کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بس ہونٹ ہل رہے تھے۔ چاچا کے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا، کیا ارشد کا آپریشن ناکام ہو گیا کیا اسے زبان نہیں مل سکی .... کیا وہ مجھے کبھی بھی دادا کہہ کر نہیں پکار سکے گا"؟

خیالات کا ایک ہجوم اس کے دماغ میں در آیا تھا۔ اس نے گھبرا کر قریب کھڑے ہوئے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر کے ہونٹ ہلے مگر آواز چاچا کو سنائی نہ دی۔ تب اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ اس کی قوت سماعت سلب ہو چکی ہے۔ دھماکے کی وجہ سے اس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے تھے۔ اس نے بےبسی سے اپنا سر تھام لیا۔ جیسے لفظ دادا سننے کی پرانی خواہش کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دے رہا ہو۔

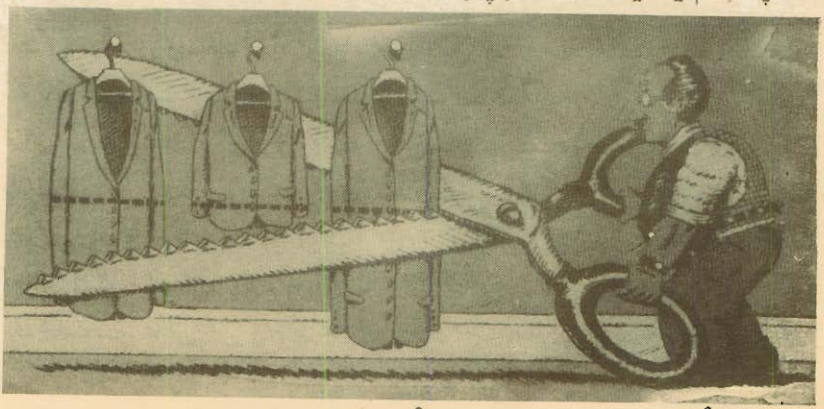

کٹنگ کا ایک جدید انداز

برطانیہ کے ۲۰ سالہ جڑواں، انڈریو اور ٹموتھی۔ (دنیا کے لمبے ترین جڑواں)

سندھ کا راجہ

آزادی

قسط نمبر ۳

سید نظر زیدی

سلسلے وار تاریخی ناول

تینوں دوست، محمد بن قاسم، موز اور سعید، آپس میں باتیں کرتے ہوئے بصرہ شہر سے باہر پہنچے۔ یہاں وہ اپنے ایک اور دوست کا انتظار کرنے لگے جو ان کے واسطے سواری کے گھوڑے لینے گیا ہوا تھا۔ موز اور سعید آئندہ عید کو ہونے والے سالانہ فوجی کرتبوں اور ان میں حصہ لینے کے اپنے ارادوں کے بارے میں ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ اس دوران ان کے گھوڑے پہنچ گئے اور وہ لوگ ان پر سوار ہو کر شہر سے ذرا دور دریا کنارے چلے گئے جہاں انہیں تیرنے. نیزہ بازی اور تلوار بازی کی مشق کرنی تھی۔ مشق کے بعد جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو ایک ڈاکو ان سے گھوڑے اور تلواریں چھیننے کی نیت سے وہاں آیا۔ محمد بن قاسم سے مقابلے کے بعد شکست کھا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ڈاکو دراصل اسلامی فوج کے ایک بہادر جرنیل بدیل تھے جو دراصل ان نوجوانوں کا امتحان لینے آئے تھے۔

عید کے دا، دمشق کے باہر ایک کھلے میدان میں فوجی کھیلوں کے مقابلے کا انتظام کیا گیا تھا اور دن بھر مختلف کھیلوں کے مقابلے ہوتے رہے تھے۔ شام کو بالآخر ایک نوجوان تلوار بازی اور نیزہ بازی کے مقابلوں میں سب کو شکست دے کر میدان میں اکیلا رہ گیا۔ وہ چیلنج دینے کے انداز میں اپنا گھوڑا ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔ اس کے لباس سے کچھ پتہ نہ چلتا کہ وہ

نوجوان کے مقابلے میں آئے مگر شکست کھا گئے۔ اب وہ نوجوان ایک انوکھی شان سے میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ کوئی اس کے مقابلے پر آنے کی جرات نہیں کر رہا تھا۔ سارا میدان اس کے لئے نعرہ ہائے تحسین سے گونج رہا تھا۔ امیر المومنین نے جب انعام دینے کے لئے اس کو اپنے قریب بلایا تو پتہ چلا کہ وہ محمد بن قاسم ہے۔ سب لوگ خوش ہوئے اور خاص طور پر امیر المومنین۔ محمد بن قاسم کی ذہانت، علمی اور فوجی قابلیت کے پیش نظر امیر المومنین نے اسے فارس کا والی مقرر کر دیا اور محمد بن قاسم اپنی والدہ سے مشورہ کرنے کی اجازت لے کر گھر چلا گیا۔

امیر المومنین ولید بن عبدالملک کی زبانی آپ سندھ کے راجہ داہر کا نام سن چکے ہیں اور آپ کو یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ یہ راجہ مسلمانوں کا بہت بڑا دشمن تھا..... اس وقت ہم آپ کو اس راجہ کے دربار کی سیر کراتے ہیں۔

سندھ کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ آج کل یہ علاقہ ہمارے ملک پاکستان کا ایک صوبہ ہے، لیکن پرانے زمانے میں سندھ ایک الگ ملک سمجھا جاتا تھا اور اس ملک پر جو راجہ حکومت کرتے تھے وہ طاقت اور روپے پیسے کے لحاظ سے بہت بڑھے ہوئے ہوتے تھے، ان کے امیر ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ دریائے سندھ کا پانی اس علاقے کی زمینوں کو ہرا بھرا رکھتا تھا۔ دوسرے آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی سمندری تجارت اس ملک کی بندرگاہوں کے ذریعے ہوتی تھی جس سے اس ملک کے حکمرانوں کو بہت آمدنی ہوتی تھی۔

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس سے ذرا پہلے سندھ پر ساہ سی نام کا ایک نیک دل راجہ حکومت کرتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے چچ نامی ایک غریب برہمن پھرتا پھراتا اس راجہ کے دربار میں آنکلا اور نیک دل راجہ نے اس کے اوپر ترس کھا کر اپنے دربار میں نوکر رکھ لیا۔ راجہ ساہ سی کے وزیر بدھی مان نے بھی غریب جان کر چچ کی خوب مدد کی۔

چاہئے تو یہ تھا کہ اس نیکی کے بدلے چچ راجہ ساہ سی کا احسان مانتا لیکن یہ کچھ اچھا آدمی نہ تھا، اس نے کیا یہ کہ رانی اور وزیر بدھی مان کے ساتھ مل کر راج پاٹ پر قبضہ کر لیا اور راجہ کی موت کے بعد اس کی رانی سے بیاہ رچا کر مزے سے حکومت کرنے لگا، مسلمانوں کے مقابلے میں ایرانیوں کی مدد کرنے کے لئے اسی راجہ نے سندھی فوج بھیجی تھی۔

چچ کی موت کے بعد اس کے دو بیٹے دھرسیہ اور داہر ملک کو دو حصوں میں بانٹ کر حکومت کرنے لگے لیکن داہر اپنے باپ سے بھی زیادہ چالاک تھا۔ اس نے جوڑ توڑ کر کے اپنے بھائی کے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا اور اس سے بھی بڑا کام یہ کیا کہ اپنی سگی بہن سے شادی کر لی جس کا نام مائی تھا۔

اس وقت سندھ کے تخت پر یہی راجہ بیٹھا تھا، اس راجہ کے دل میں ایسا غرور اور شیخی تھی کہ کیا

بتائیں۔ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے بڑھ کر جانتا تھا اور اپنے امیروں وزیروں کے ساتھ بیٹھا ساری دنیا پر حکومت کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے دربار میں بیٹھا اسی قسم کی باتیں کر رہا ہے، اس نے ایک سردار کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیوں مان سنگھ! یہ بات سچ ہے کہ عرب کے مسلمانوں کی حکومت میں پھوٹ پڑ گئی ہے؟"

مان سنگھ:۔ "بالکل سچ ہے مہاراج! خلیفہ ولید بن عبدالملک اپنے بھائی سلیمان بن عبدالملک کی جگہ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد بنانا چاہتا ہے۔ اس بات پر بڑے بڑے مسلمان سردار دو ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں اور اب ان کے درمیان تلوار چلنے ہی والی ہے۔"

راجہ:۔ (زور سے ہنس کر) "بس ٹھیک ہے، تم اپنے جاسوس لگائے رکھو جیسے ہی مسلمانوں میں آپس کی لڑائی شروع ہوئی فوراً عرب پر حملہ کردیں گے اور اس طرح ان سارے ملکوں کا بدلہ لے لیں گے جنہیں یہ ملیچھ مسلمان فتح کر چکے ہیں۔"

مان سنگھ:۔ "مہاراج میرا تو خیال ہے ہمیں اس بات کا بھی انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ مسلمانوں کے درمیان آپس میں لڑائی شروع ہو بلکہ فوراً حملہ کر دینا چاہئے۔ ہمارے سامنے ان مسلمانوں کی ہستی ہی کیا ہے، اگر اب تک ان کو کامیابی حاصل ہوتی رہی ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ کسی بہادر سے آمنا سامنا ہی نہیں ہوا۔"

راجہ:۔ "ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ کبھی ہم سے مقابلہ ہوا تو پتہ چلے گا کہ بہادر کس طرح لڑتے ہیں۔ (ایک اور سردار کی طرف دیکھ کر) کیوں سردار مولا! تمہارا کیا خیال ہے؟"

مولا:۔ "مہاراج معاف کیجئے۔ میرا تو خیال ہے ہمیں مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہئے۔ حکومت کے سوال پر ان کے اندر چاہے کتنی بھی پھوٹ ہو لیکن جہاں تک ان کی بہادری اور اچھائیوں کا سوال ہے اس میں کسی قسم کا شک نہیں۔ یہ بات سردار مان سنگھ بھی مانیں گے کہ اس پھوٹ اور آپس کی دشمنی کے زمانے ہی میں ان کا ایک سردار قتیبہ بن مسلم باہلی ترکستان کا علاقہ فتح کرتا ہوا بخارا اور سمرقند تک پہنچ گیا ہے اور دوسرا سردار طارق بن زیادہ یورپ کے ملک اندلس میں برابر بڑھتا چلا جارہا ہے۔"

راجہ:۔ (غصے بھری آواز میں) "اور تمہارا مشورہ تو یہ بھی ہے کہ ہم ذات پات کا خیال چھوڑ کر اچھوتوں اور برہمنوں کو ایک برابر سمجھنے لگیں۔"

مولا:۔ ہاں مہاراج! اور یہ مشورہ میں آج بھی دوں گا، آپ یقین کیجئے مسلمانوں کی طاقت اور بڑائی کا اصلی بھید یہی ہے کہ انہوں نے ذات پات کے بندھن توڑ کر سب انسانوں کو برابر کا درجہ دے دیا ہے۔ ان کے ہاں صرف اسے بُرا سمجھا جاتا ہے جو بُرے کام کرے۔"

راجہ:۔ (پوری طاقت سے چلا کر) "خاموش رہو۔ آج ہمیں معلوم ہو گیا کہ تم برہمن نہیں کسی

اچھوت کی نسل سے ہو۔ نکل جاؤ ہمارے دربار سے اور آئندہ ہمیں اپنی صورت نہ دکھانا ورنہ فوراً قتل کرادیں گے۔ "

راجہ کی یہ بات سن کر مولا کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا، اس نے جلدی سے اپنی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گیا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا دربار سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ آخر راجہ نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے کہا،

راجہ:۔ "اگر تم میں سے کسی اور نے بھی کبھی ایسی ہی بزدلی کی باتیں کیں تو اسے بھی اسی طرح نکلوا دیا جائے گا۔ ہم اپنے دربار میں صرف بہادر سپاہیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ "

مان سنگھ:۔ "اور کوئی ایسا کیوں ہونے لگا مہاراج! یہ مولا تو سدا کا بزدلا تھا.....! "

راجہ:۔ (مان سنگھ کی بات کاٹ کر) "اچھا اب اس کے بارے میں کوئی بات نہ کی جائے۔ تم لنکا کے ان جہازوں کی بابت بتاؤ جو مسلمانوں کو لے کر بصرے جارہے ہیں۔ ان کے لئے تم نے کیا انتظام کیا ہے؟ "

مان سنگھ:۔ "مہاراج کی دعا سے یہ جہاز تو ان چڑیوں کی طرح ہیں جو شکاری کے جال میں پھنس چکی ہوں۔ ہمارے جہاز ان کے چاروں طرف پھیل چکے ہیں جب چاہیں گے انہیں لوٹ لیں گے، لیکن میں نے یہ بندوبست کیا ہے کہ ہمارے بہادر سپاہیوں کی تلواروں کو ان کے ناپاک خون کے دھبے نہ لگیں بلکہ یہ کام اچھوت لٹیرے انجام دیں۔ "

راجہ:۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟ ذرا کھول کر بیان کرو۔ "

مان سنگھ:۔ "مہاراج میرا مطلب یہ ہے کہ ان جہازوں کو لوٹنے کا کام میں نے سمندری لٹیروں کی ایک ٹولی کے ہاتھ میں دے دیا ہے اور میرا خیال ہے بس آج کل ہی میں آپ یہ خبر سن لیں گے کہ مسلمانوں کے جہاز لٹ گئے۔ "

راجہ:۔ (لمبا ہنکارہ بھر کر) "ہونہہ...... اچھا یہ معلوم ہوسکا کہ ان جہازوں میں کتنے آدمی ہیں اور کیا کیا مال اسباب لدا ہوا ہے؟ "

مان سنگھ:۔ "یہ بات سن کر شاید مہاراج خوش نہ ہونگے کہ جہازوں میں زیادہ تر عورتیں اور کم عمر بچے ہیں۔ "

راجہ:۔ "کیوں! کیا اب مسلمانوں کو اپنی فوج میں عورتوں اور بچوں کے بھرتی کرنے کی ضرورت پڑ گئی؟ "

مان سنگھ:۔ (ہنستے ہوئے) ایسا وقت بھی بہت جلد آنے والا ہے مہاراج! لیکن عورتیں اور بچے ان سوداگروں کے ہیں جنہیں ہم نے پچھلے مہینے سمندر میں ڈبو یا تھا، لنکا کا راجہ ان بچوں اور عورتوں کو اس لئے

بھیجے رہا ہے کہ مسلمان اس کی وفاداری کی تعریف کریں۔"

راجہ:۔ بزدل کہیں کا..... خیر تم اس بات کا پورا پورا بندوبست کرو کہ ایک ننھا سا بچہ بھی بچ کر نہ جانے پائے۔ ہمارا خیال ہے ان عورتوں اور بچوں کے پکڑے جانے سے مسلمانوں کو اتنا رنج ہو گا جتنا کسی ملک کے ہاتھ سے نکل جانے کا بھی نہ ہوتا۔"

یہ کہہ کر راجہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے جانے کے بعد درباری بھی اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

ہندوستان کے سمندر میں دو چھوٹے چھوٹے تجارتی جہاز آہستہ آہستہ مغرب کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ ان میں سے جو جہاز آگے ہے اس کا ناخدا اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے عرشے پر آہستہ آہستہ ٹہل رہا۔ یہ لنکا کا رہنے والا ہے اور اس کے سانولے چہرے سے اس وقت بہت زیادہ گھبراہٹ ظاہر ہو رہی ہے۔

ذرا فاصلے پر ایک عرب نوجوان بادبان کا رسہ پکڑے چپ چاپ ناخدا کی طرف دیکھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر تک یونہی دیکھتے رہنے کے بعد یہ نوجوان اس کے پاس آیا اور محبت بھری آواز میں بولا،

نوجوان:۔ "آپ بے حد پریشان نظر آ رہے ہیں۔ کیا میں اس کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟"

ناخدا:۔ (چونک کر) "ہاں میں اس وقت واقعی بہت زیادہ پریشان ہوں۔ اب تک میں اپنی پریشانی کی وجہ آپ سب سے چھپائے ہوئے تھا لیکن اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ سب کچھ بتانا ہی پڑے گا۔"

نوجوان:۔ "مصیبت کے وقت میں آپ ہمیں بہت اچھا دوست پائیں گے۔"

ناخدا:۔ "آپ دور سمندر میں وہ چند دھبے سے دیکھ رہے ہیں؟"

نوجوان:۔ "ہاں دیکھ رہا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سمندری جہاز ہیں اور دو تین دن سے ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔"

ناخدا:۔ "یہ جہاز ہمارے ساتھ سفر نہیں کر رہے بلکہ ہمیں اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔"

نوجوان:۔ "لیکن کیوں! ہمیں گھیرنے سے ان کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

ناخدا:۔ "میں کئی دن سے اس بات پر غور کر رہا تھا اور اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ ان کی نیت ٹھیک نہیں۔ مجھے یہ سمندری لٹیروں کے جہاز معلوم ہوتے ہیں جو ہمیں لوٹنا چاہتے ہیں۔"

نوجوان:۔ "اچھا.....!"

ناخدا:۔ "ہاں۔ ابھی ابھی شیشوں کا عکس ڈال کر انہوں نے ایک دوسرے کو یہ پیغام دیا ہے کہ ہمیں اور آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔"

نوجوان:۔ "پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"
ناخدا:۔ "میں آپ کے مشورے کے بغیر کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا، ویسے ان کے ساتھ لڑ کر جیتنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ ہمارے دونوں جہازوں پر ملاحوں سمیت بیس پچیس آدمی ایسے ہیں جو تلوار لے کر لڑ سکیں، باقی ننھے بچے اور عورتیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ہمارے مہاراجہ کی یہ بات کیوں نہ مانی کہ جہازوں کی حفاظت کے لئے فوج کا ایک دستہ ساتھ لے لیا جائے۔"
نوجوان:۔ "لیکن آپ کو گھبرانا نہیں چاہئے۔ اس وقت ہم سندھ کی بندرگاہ دیبل کے بالکل پاس پہنچ چکے ہیں، سندھ کے راجہ سے ہمارے ملک کی دوستی ہے اس لئے وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔"
نوجوان کی یہ بات سن کر ناخدا نے دردناک انداز میں ہنستے ہوئے کہا،
ناخدا:۔ "اور میرے نزدیک سب سے بڑا خطرہ یہی ہے کہ ہم سندھ کی بندرگاہ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ یہ ڈاکو کئی دن سے اس بات کا انتظار کر رہے تھے۔"
نوجوان:۔ "وہ کیوں.....؟"
ناخدا:۔ "اس لئے کہ راجہ کی فوج کی مدد کے بغیر ان ڈاکوؤں میں ہمارے جہاز لوٹنے کی ہمت نہیں ہو سکتی، شاید آپ کو معلوم نہیں اس سمندر میں جتنے جہاز لوٹے جاتے ہیں سندھ کی سمندری فوج کی مدد سے لوٹے جاتے ہیں۔"
نوجوان:۔ (حیران ہو کر) "اچھا.....؟"
ناخدا:۔ "ہاں۔"
نوجوان:۔ "پھر اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"
ناخدا:۔ "آپ جو فیصلہ بھی کریں میں اور میرے ساتھی اس پر سچے دل سے عمل کریں گے۔"
نوجوان:۔ (کچھ دیر سوچ کر) "میرا ذاتی فیصلہ تو یہ ہے کہ گنتی اور طاقت میں کم ہونے کے باوجود ہمیں ان بزدل ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنا چاہئے۔"
ناخدا:۔ "تو میں آپ کے ساتھ ہوں، لیکن ہمارے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ساتھ بہت سے ننھے بچے اور عورتیں ہیں۔ اور میرا اب تک کا تجربہ یہ ہے کہ لڑائی کے وقت اپنے بچے اور عورتیں ہی سب سے بڑی مصیبت ثابت ہوتی ہیں۔"
نوجوان:۔ (مسکراتے ہوئے) "لیکن آپ بے فکر رہئے اب ایسا تجربہ نہیں ہوگا۔ آپ دیکھیں گے رونے چلانے کی جگہ ہر مسلمان عورت اور بچہ بہادر سپاہیوں کی طرح ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرے گا۔"
ناخدا:۔ (حیران ہو کر) "تو کیا آپ کی عورتیں تلوار چلانا اور دوسرے فوجی کرتب جانتی ہیں؟"

نوجوان:۔ "اچھی طرح۔ بہرحال اب ہمیں باتوں میں وقت برباد نہیں کرنا چاہئے۔ شاید وہ جلدی ہی حملہ کردیں!"

ناخدا:۔ "ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ آپ عورتوں اور بچوں کے پاس جاکر آنے والے خطرے سے انہیں خبردار کیجئے۔ میں ضروری انتظام کرتا ہوں۔"

نوجوان:۔ "بہت اچھا،"

یہ کہہ کر نوجوان جہاز کے اس کمرے کی طرف چلا گیا جس میں عورتیں اور بچے تھے اور ناخدا نے ملاحوں کو اکٹھا کر کے لڑنے کے لئے تیار ہونے کا حکم دے دیا۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

عرب مسافروں کے یہ دونوں جہاز سارا دن امن امان سے چلتے رہے لیکن جیسے ہی شام کا دھندلکا ہوا سمندری ڈاکوؤں کے دو تیز رفتار جہازوں نے آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیا، اور پھر آگ لگانے والے تیر برساتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگے۔

ناخدا اور عرب نوجوان نے جس کا نام زید ہے آپس کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جم کر لڑنے کی جگہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ اس لئے اپنے جہازوں کا رخ بدل کر مشرق کی طرف نکل جانے کی کوشش کی، لیکن ڈاکوؤں کے جہاز بالکل ہلکے اور تیز چلنے والے تھے، ابھی ان کے جہازوں کا رخ پوری طرح تبدیل بھی نہ ہوا تھا کہ وہ گھوم کر ان کے سامنے آگئے اور یہ حال دیکھ کر انہیں مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ صرف بچاؤ کرنے کی جگہ جم کر مقابلہ کرنا چاہئے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے جلدی جلدی اپنے دونوں جہازوں کے بادبان اتروا دیئے۔ کیونکہ ڈاکوؤں کے جلتے ہوئے تیروں سے ان میں آگ لگ جانے کا خطرہ تھا اور پھر اپنے کل آدمیوں کو دو حصوں میں بانٹ کر لڑنے کے لئے تیار ہوئے۔ ایک ٹولی تیر کمان سنبھال کر مناسب ٹھکانوں پر بیٹھ گئی اور دوسری کے ذمے یہ کام لگایا کہ ڈاکوؤں کے جہازوں کی طرف سے جو تیر آئیں جلدی جلدی انہیں بجھا دیں۔

عرب عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈال کر ہاتھوں میں تیر کمان لے کر جہاز کے ایک حصے کی حفاظت کے لئے تیار ہوئیں اور ننھے ننھے بچے بھی اپنی چھوٹی چھوٹی تلواریں اور تیر کمان لے کر لڑنے کے لئے ڈٹ گئے۔ وہ سب یوں خوش نظر آرہے تھے جیسے کوئی بہت ہی دلچسپ تماشہ ہونے والا ہو۔

لنکا کے رہنے والے ملاح اور ناخدا، عرب عورتوں اور بچوں کی یہ ہمت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔

ناخدا نے جوش بھری آواز میں کہا،

"ایشور کی قسم دنیا کی کوئی طاقت ایسے لوگوں کو نیچا نہیں دکھا سکتی جن کے بچے اور عورتیں ایسی بہادر اور نیک

ہوں۔" اس کی یہ بات سن کر زید آہستہ سے مسکرا دیا، پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولا۔

"یہ سب اسلام کی برکت ہے۔ اس مقدس مذہب نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ انصاف اور سچائی پر ہوں تو اپنی جان کی ذرا پروا نہ کریں اور کسی وقت بھی ظلم کے سامنے سر نہ جھکائیں۔"

زید کی یہ بات سن کر ناخدا کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ڈاکوؤں کا ایک جہاز تیز تیز چلتا ہوا ان کے پچھلے جہاز کے بالکل پاس پہنچ گیا اور اسے لڑائی کی طرف دھیان دینا پڑا۔

جس جہاز پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا اس میں زیادہ تر عورتیں اور بچے سوار تھے، اس لئے ناخدا کو اور بھی فکر ہوئی۔ اس نے چلا چلا کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اپنی پوری طاقت سے دشمن کے جہاز پر تیر برساؤ۔ خبردار کوئی ڈاکو عورتوں کے جہاز پر نہ آنے پائے۔ شاباش بہادرو! عرب ماؤں کی حفاظت کر کے اپنے دیس کی لاج رکھ لو۔"

ڈاکوؤں کے جہاز کے پاس آتے ہی ناخدا والے جہاز پر اک دم شور مچ گیا تھا ملاح چلا چلا کر ایک دوسرے کو لڑنے پر ابھار رہے تھے، لیکن عرب عورتوں اور بچوں والے جہاز پر قریب قریب خاموشی چھائی ہوئی تھی، کبھی کبھی بچوں کے چلانے کی جوش بھری آواز آجاتی تھی یا تیروں کی سنسناہٹ سنائی دیتی تھی۔

اتنی دیر میں ناخدا کی نظر ڈاکوؤں کے جہاز کی طرف جو اٹھی تو وہ خوشی سے اک دم چلا اٹھا آگ لگانے والے کئی تیر اس کے بادبانوں میں اٹکے ہوئے تھے اور ان سے آگ کے لمبے لمبے شعلے نکل رہے تھے۔

ادھر عرب بچوں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کی طرف سے بے پروا ہو کر جہاز کے مختلف حصوں میں پھرکیوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ جیسے ہی کوئی جلتا ہوا تیر گرتا تھا وہ جلدی سے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیتے تھے، یا پانی ڈال کر اسی جگہ بجھا دیتے تھے۔ ناخدا کی خوشی بھری آواز سن کر زید نے کہا۔

"دیکھا آپ نے، میرا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ ڈاکوؤں نے عورتوں اور بچوں والے جہاز پر ہی حملہ کیا اور انہیں اپنی پھرتی اور طاقت پر اتنا گھمنڈ تھا کہ اپنے بادبان اتارنے بھی ضروری نہ سمجھے، سمجھتے ہونگے عورتیں اور بچے انہیں دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائیں گے۔"

ناخدا۔ "انہوں نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔ کوئی اور عورتیں ہوتیں تو بالکل یہی ہوتا۔"

ابھی ناخدا کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ڈاکوؤں کے جہاز سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں، بادبانوں کی آگ جہاز کے نچلے حصوں کی طرف پھیل چکی تھی اور ڈاکو بدحواس ہو کر سمندر میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔

ڈاکوؤں کے دوسرے جہاز والوں نے اپنے ساتھیوں کا یہ حال دیکھا تو وہ بھی بہت پریشان ہوئے اور

ناخدا والے جہاز کا چکر کاٹ کر اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لئے ان کے پاس جانے کی کوشش کی، لیکن ناخدا نے کوشش کر کے اپنے جہاز کو ان کے جہاز سے بھڑا دیا اور تلوار سونت کر ان کے جہاز میں کود پڑا۔ اس کے ساتھ ہی آٹھ دس ملاح بھی ڈاکوؤں کے جہاز پر آگئے اور مستولوں پر چڑھ کر بادبانوں میں آگ لگا دی۔

ڈاکوؤں کے لئے یہ حملہ بالکل ایسا تھا جیسے کوئی بے خبری میں دھکا دے دے۔ کہاں تو وہ ان جہازوں کا مال اسباب لوٹنے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے کہاں اپنی جانیں بچانی مشکل ہو گئیں۔ اس اچانک حملے کے بعد کتنی ہی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکے کہ یہ سب کچھ کیا ہوا اور کیونکر ہوا اور جب ذرا حواس ٹھکانے آئے تو ناخدا اور زید کے آدمی انہیں اچھی طرح گھیر چکے تھے۔

ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے آپ کو بالکل بے بس دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے بعد اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے اپنے ہتھیار رکھ دیئے اور ناخدا کے حکم سے ملاحوں نے ان کے ہاتھ باندھ کر جہاز کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔

دیانت دار

لیک بیکری کی جانب سے اخبار میں اشتہار شائع ہوا کہ ایک دیانت دار کارکن کی ضرورت ہے۔ انٹرویو کے لئے جو پہلا شخص آیا اس سے پہلا سوال اس کی دیانتداری کے بارے میں کیا گیا امیدوار نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے تین سال ایک حمام میں کام کیا اور کبھی نہیں نہایا۔" محمد فیصل

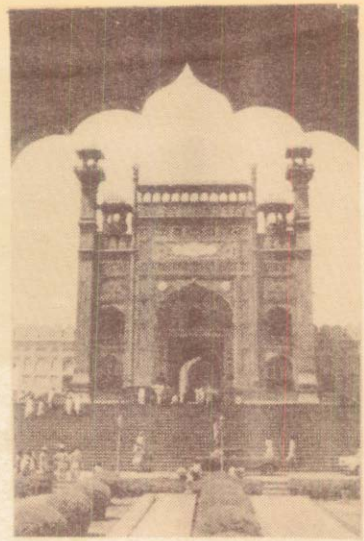

بادشاہی مسجد

گلفام

گمنام معماروں کی تخلیق کا دلکش نمونہ

بادشاہی مسجد جو کہ پاکستان کی دوسری بڑی مسجد اور کچھ عرصہ پہلے سب سے بڑی مسجد تھی تاریخی شہر لاہور میں واقع ہے۔ لاہور کا شمار پاکستان کے چند پرانے اور تاریخی شہروں میں ہوتا ہے۔ اس کی شہرت بین الاقوامی ہے اور اس شہرت میں چار چاند اس عظیم مسجد نے لگائے ہیں۔

یہ مسجد ۱۰۸۴ھ میں تعمیر ہوئی یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ کسی تاریخ میں اس مسجد کا حوالہ نہیں ملتا مگر ایک **شاہی فرمان** جو دربار سے جاری ہوا کہ ایک مسجد جو نزاکت و لطافت میں اپنی مثال ہو اسے دارالسلطنت لاہور میں تعمیر کیا جائے ایک پرانی تاریخی تحریروں پر مشتمل کتاب سے ملا ہے جو ایک اسکالر کی ذاتی ملکیت ہے۔

بادشاہی مسجد کا مکمل رقبہ تقریباً ۲۵،۷۷،۷ مربع گز ہے اس کا صدر دروازہ سطح زمین سے تقریباً اکیس سیڑھیاں چڑھ کر آتا ہے چبوترے سے گزر کر ہم اندر وسیع صحن مسجد میں داخل ہوتے ہیں جو آج تقریباً تمام چوکور سنگ سرخ کی سلوں سے آراستہ ہے تمام فرش میں معمولی سا

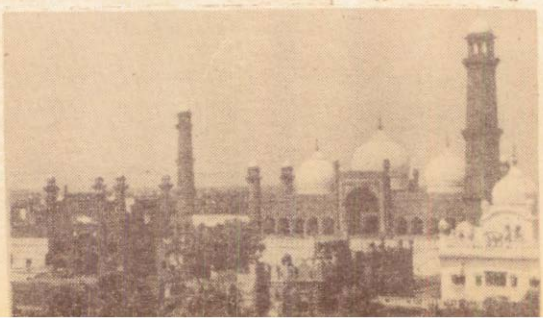

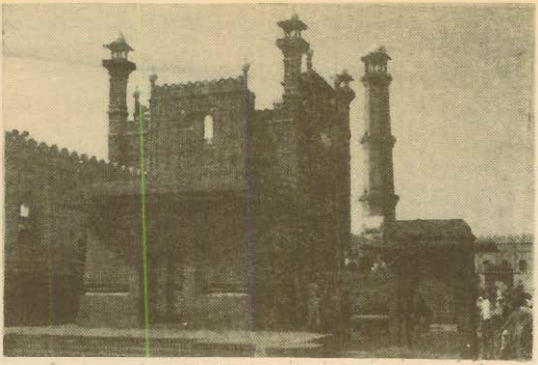

جھکاؤ شمال کی طرف دیا گیا ہے تاکہ بارش کا پانی باآسانی ان پنجروں سے نیچے چلا جائے جو اس وسیع صحن میں نظر آتے ہیں۔ صحن کے درمیان میں وضو کے لئے ایک چوکور حوض ہے جسکا ہر ضلع پچاس فٹ ہے۔

مسجد کا وسیع صحن چاروں طرف یکساں طرز کے دالانوں سے آراستہ ہے جو سطح سے ۲۱ فٹ بلند ہیں پاکستان بننے کے بعد مشرقی دالانوں کو دوبارہ تعمیر کیا گیا کیونکہ جب ۱۸۵۶ء میں مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کیا تھا تو اسے گرا دیا تھا تاکہ اندر نظر رکھی جا سکے ان دالانوں کے دونوں طرف وضو کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے جو مسجد کی اصل تعمیر میں نہ تھا۔

مسجد کے ایوان کی مرکزی اونچائی اسی ۸۰ فٹ ہے جس کے اوپر پرچین کاری میں سفید مرمریں گل بوٹے دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مسجد کا حسن اس کے ایوان میں ہے اس ایوان کے دو حصے ہیں جن کے بیچ دیوار ہے اسی حصے میں محراب و ممبر بھی ہیں مگر موجودہ ممبر حال ہی کی تعمیر ہے۔

مسجد کو دور سے متوجہ کرنے والے اسکے ایوان کے اوپر سفید سنگ مرمر کے تین بلند گنبد ہیں درمیانی گنبد زیادہ بلند اور بڑا ہے گنبدوں پر سنہری کلس دور سے چمکتے ہیں اور الٹے کنول کے پھول کی طرز پر ایسے قائم ہیں غور سے دیکھنے پر وہ کھلا ہوا معلوم ہوتا ہے مسجد کا نمایاں پہلو اسکے چار سرخ پتھر کے مینار اسکے چاروں کونوں پر آج بھی قائم ہیں اور دور سے نظر آتے ہیں یہ مینار زمین سے بیس فٹ بلندی سے شروع ہوتے ہیں اور اس کے اوپر تین منزلیں ہیں انکی اونچائی ۱۴۳½ فٹ ہے برجیاں اس کے علاوہ ہیں یہ مینار ہشت پہلو ہیں اور ان کے اوپر سے پورے لاہور کا نظارہ ہو سکتا ہے۔

عام لوگوں کے نزدیک یہ مسجد صرف سرخ پتھر سے بنی نظر آتی ہے کیونکہ ہر طرف یہی نظر آتا ہے مگر اس میں سرخ پتھر کے علاوہ اکثر جگہوں پر سرخ پتھر کی سطح پر سفید سنگ مرمر سے پرچین کاری بھی کی ہوئی ہے مسجد کے مینار بھی سفید سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔

مسجد میں تین چار قسم کے نقش و نگار نظر آتے ہیں یہاں پر بسنت کاری کے ایسے خوبصورت نمونے دیکھنے میں آتے ہیں کہ الفاظ ان کا احاطہ نہیں کر سکتے یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ اس عظیم

مسجد کے معمار کا کسی کو نہیں پتا اس کے نام یا کوئی دوسرے حالات لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں اور آج کتنی تلاش بسیار کے بعد بھی ہم یہ معلوم نہیں کر سکے کہ اسکا معمار کون ہے

آج ہم فخر سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ مسجد اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں تعمیر ہوئی اور اسلامی فنِ تعمیر کے کا منفرد نمونہ ہے اور اسکے علاوہ کسی اور عمارت میں اتنی خوبیاں نہیں یہ نقش و نگار میں اپنی مثال آپ ہے قیام پاکستان کے بعد اس کی تزئین مرمت پر بہت سی رقم خرچ کی گئی جس کی وجہ سے اس کا حسن مزید نکھرا ہے۔

عازمینِ حج

متوجّہ ہوں

خوش نصیب ہے وہ شخص جسے اللہ نے حجازِ مقدّس کے سفر کے لیے منتخب کر لیا۔

اِس سال فریضۂ حج کی ادائیگی پر جانے والے تمام حجّاج کی خدمت میں ضمیر الدّین میموریل آرگنائزیشن ایک ایسا تحفہ پیش کر رہی ہے جو سفرِ حج اور مناسکِ حج کے دوران اُن کے لیے بہترین زادِراہ ثابت ہو گا۔

جناب شیخ ضمیر الدّین احمد (مرحوم)، کی تالیف کردہ کتاب "سفرِ مُبارک" بلا قیمت حاصل کرنے کے لیے فریش ویل سوئیٹس۔ کراچی کے کسی بھی پوائنٹ پہ اپنی حج کی دستاویزات دکھا کر یہ کتاب مُفت حاصل کی جا سکتی ہے۔

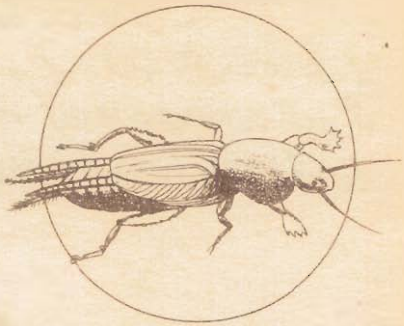

بیچارہ جھینگر اور مغرور کاکروچ

شاھنواز فاروقی

رہتا تھا اک کچن میں کہیں ایک کاکروچ
دنیا کے معاملات میں گہری تھی اُس کی سوچ
تھا اس کچن میں حضرتِ جھینگر کا بھی قیام
تھا سنگروں میں آپ کا اونچا بہت مقام
دونوں کی دوستی تھی کچن بھر میں اک مثال
اک دوسرے کا رکھتے تھے دونوں بڑا خیال
اپنی برادری میں وہ سب سے امیر تھے
ڈبوں کے درمیان رہائش پذیر تھے
پھر یوں ہوا کہ مل گئی مٹی میں اُن کی شان
رہنے لگا کھنچاؤ سا دونوں کے درمیان
جب حد سے زیادہ بڑھ گیا دونوں کا یہ کھنچاؤ
جھینگر کے دل پہ لگنے لگے گہرے گہرے گھاؤ
جھینگر نے کاکروچ سے پھر پوچھ ہی لیا
سچ سچ بتاؤ دوست تمہیں ہوگیا ہے کیا؟

کیا بات ہے کہ گھر سے نکلتے نہیں ہو تم
آتا ہوں گھر تمہارے تو ملتے نہیں ہو تم
شادی میں بھی تم آئے نہیں بھائی جان کی
کٹوا دی تم نے ناک مرے خاندان کی
شدّت سے غم کی دکھنے لگا میرا جوڑ جوڑ
اے پیارے کاکروچ نہ رشتے کو ایسے توڑ
گر ہو سکے تو مجھ کو اِسی وقت یہ بتا
کیا ہوگئی ہے ذات سے سرزد مری خطا
جھینگر کی بات سُن کے کہا کاکروچ نے
مجھ کو بدل دیا ہے مری ایک سوچ نے
کچھ دن ہوئے کِچن میں یہ کہتا تھا خود سے زید
افسوس آدمی کا لہو ہوگیا سفید
آزاد کر رہا ہوں حقیقت جو قید ہے
تم جانتے ہو میرا لہو بھی سفید ہے
یعنی اِس اعتبار سے انسان میں بھی ہوں
تجھ سے بڑا، انوکھا و ذیشان میں بھی ہوں
انسان ہو کے تجھ سے مِلوں یہ نہیں ہے ٹھیک
جا دوستی کی مانگ کسی اور در سے بھیک

دُودھ کی بدولت

ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال

روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت

کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"

ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔

اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔

دائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو

اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

MASS

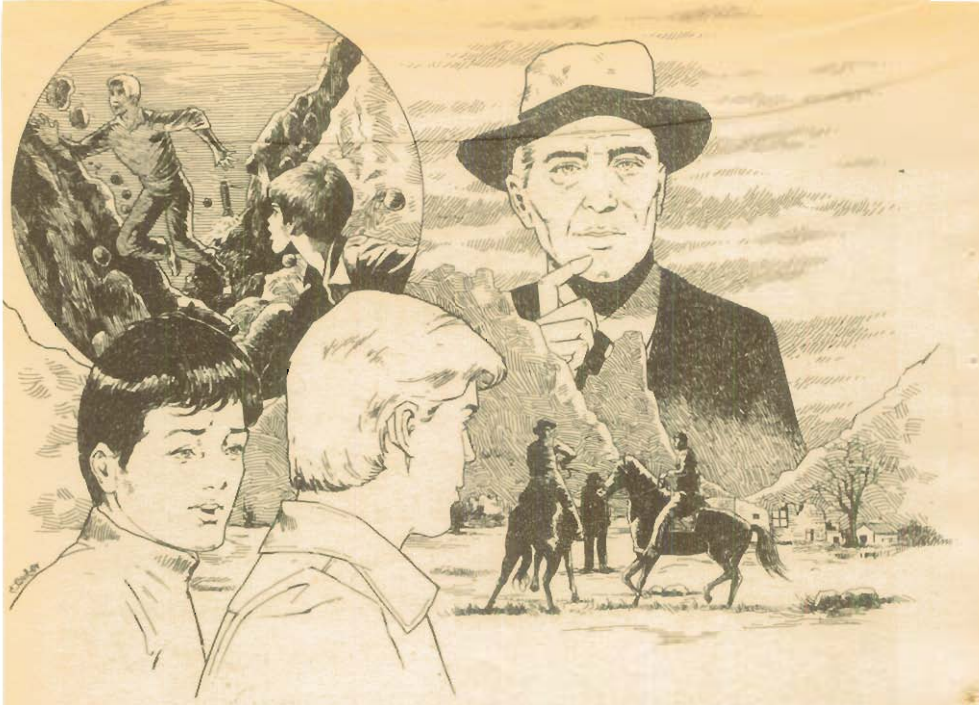

چاندی نگر میں سونا

شاہنواز فاروقی

دوسرا اور آخری حصہ

مائک اور روڈی بلا ارادہ ہی اس اجاڑ سے قصبے میں نکل آئے تھے۔ تمام مکانات خالی تھے اور دیواریں اور گلیاں دھول سے اٹی پڑی تھیں۔ لگتا تھا عرصہ ہوا لوگ یہاں سے چلے گئے تھے۔ وہاں گھومتے ہوئے ان کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جس نے انہیں بتایا کہ پانچ سال پہلے تک یہ قصبہ بہت حسین اور خوش حال تھا۔ مگر پانی کی کمی کی وجہ سے لوگ یہاں سے ہجرت کر گئے۔ دونوں دوست اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر واپس انکل جو کے گھر پہنچے، انکل جو اپنے جانوروں کی وجہ سے خاصے پریشان تھے جنہیں ایک وباء نے آلیا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی جانور موت کے منہ میں چلا جاتا تھا۔ ایسے افسردہ ماحول میں بھلا ان کی چھٹیاں کیا خاک مزے میں گزرتیں۔ پھر بھی ایک دن دونوں دوست بے دلی سے ایک مہم پر روانہ ہوئے۔

سونے کی ایک پرانی کان میں داخل ہوئے ابھی وہ زیادہ دور اندر تک نہیں گئے تھے کہ اچانک کان کی دیواریں دھماکوں سے لرزنے لگیں۔

اب آگے پڑھیئے

"مائک" روڈی نے خوف زدہ ہو کر ایک اور آواز لگائی "مائک، مائک، مائک تم کہاں ہو؟" پھر وہ چیخنے لگا۔

پھر چند لمحوں بعد وہاں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ روڈی کو یہ سناٹا آر اس کے سناٹے سے بھی زیادہ ڈرا دینے والا لگا۔

روڈی نے ایک بار پھر مائک کو آواز دی۔ پھر اسے اپنی ٹارچ یاد آئی۔ دھماکے کے وقت یہ ٹارچ نیچے گر گئی تھی۔ روڈی نے آس پاس ہاتھ مارے تو ٹارچ مل گئی۔ اگرچہ وہ اب کئی جگہوں سے ٹوٹ گئی تھی مگر وہ اب بھی جل سکتی تھی، یہ دیکھ کر روڈی کو کچھ سکون محسوس ہوا۔ اس نے ٹارچ جلا کر اس کی روشنی ادھر ادھر ڈالی تو اس کے منہ سے مارے خوف کے چیخ نکل گئی۔ اس نے دیکھا کہ دھماکے سے ذرا پہلے وہ اور مائک جہاں کھڑے تھے وہ جگہ بھاری پتھروں سے اٹی پڑی تھی۔ لیکن فی الحال روڈی کو مائک کی فکر تھی۔ معلوم نہیں وہ کہاں تھا۔؟

روڈی نے اپنے پیروں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو اس نے دیکھا کہ اس کے قدموں سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا سا سوراخ بنا ہوا ہے۔ مائک یقیناً اسی سوراخ میں گر کر نیچے گیا ہے خدا جانے وہ زخمی ہے یا مر گیا۔ روڈی نے کانپتے ہوئے سوچا۔

روڈی نے مائک کو ایک اور آواز دی مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ "اگر کوئی اور شخص میرے ساتھ ہوتا اور ہمارے پاس لالٹین اور رسی ہوتی تو مائک کو آسانی کے ساتھ نکالا جا سکتا تھا۔" روڈی نے تیزی کے ساتھ سوچا "اب مجھے جلدی سے کان سے نکل کر جلد از جلد مدد حاصل کرنی چاہئے۔"

چنانچہ روڈی تیزی کے ساتھ سرنگ سے باہر جانے کے لئے چل پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی ٹارچ کان کے آخری سرے تک اس کا ساتھ دے گی۔ اسے کان کا راستہ بڑا ہی طویل لگ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یہ کبھی ختم ہی نہیں ہو گا۔ کان اس کے لئے ایک خوفناک شے بن چکی تھی۔

پھر اچانک روڈی کی آنکھوں کے سامنے روشنی کا ایک دائرہ آ ہی گیا۔ روڈی تیزی کے ساتھ اس طرف دوڑا۔ کان سے باہر نکل کر اس نے تازہ ہوا میں گہرا سانس لیا اور پھر وہ انکل جو کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ انکل جو کے گھر کے پاس پہنچتا اس نے دیکھا کہ انکل جو اور ان کے کئی پڑوسی انکل جو کے باڑے کے پاس کھڑے ہیں۔

"معاف کرنا بچو" انکل جو نے روڈی کے قریب آتے ہی کہا۔

"اب تمہارے لئے یہاں کوئی کام باقی نہیں رہا۔ میرے خیال میں تم جلد از جلد اپنا سامان باندھ

لو، چاندی نگر اب خالی ہوا ہی چاہتا ہے۔ " انکل جو کا چہرہ تناؤ اور دکھ سے پیلا پڑا ہوا تھا۔

"اور اب میں ان کے لئے ایک اور بری اطلاع لایا ہوں، کاش یہ پہلے ہوچکا ہوتا" روڈی نے دل میں سوچا۔

"انکل جو" روڈی نے کپکپاتی ہوئی آواز سے کہا "ہم اس پرانی کان میں تھے کہ زمین پھٹ گئی اور مائک کہیں نیچے جاگرا۔ پلیز جلدی سے رسّیاں اور لالٹین لے کر وہاں چلیں اور مائک کو وہاں سے نکالیں"

انکل جو یہ سنتے ہی اپنی پریشانی بھول گئے اور پھر چند ہی منٹوں بعد وہ اور ان کے دوست ہاتھوں میں لالٹینیں اور رسیّاں لے کر کان کی جانب روانہ ہو گئے۔

کان کے اندر پہنچ کر لالٹینیں ٹارچوں سے زیادہ موثر ثابت ہوئیں۔ وہ جیسے جیسے کان کے اندر جاتے گئے روڈی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی رہی کہ وہ کان خاصی چوڑی تھی۔ چند لمحوں بعد انہیں لکڑی کا ایک موٹا سا گٹھا پڑا ملا۔ روڈی کو اسے دیکھتے ہی یاد آگیا کہ اب وہ اپنی منزل کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔

انکل جو کا ایک تجربہ کار دوست ان سب کی رہنمائی کر رہا تھا۔ " ذرا دھیان سے چلئے" وہ بار بار کہتا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک جگہ رک گیا اور بولا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ جگہ یہی ہے" وہاں ہر طرف پتھر ہی پتھر بکھرے پڑے تھے۔ اور زمین میں ایک بڑا سا سوراخ موجود تھا۔ سوال یہ تھا کہ کون نیچے جائے اور کس طرح؟ اس بحث کے درمیان مائک کا خیال تھوڑی دیر کے لئے سب لوگوں کے ذہنوں سے نکل گیا بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئے۔

"ہاں تو نوجوانوں" انکل جو اپنے کمر کے گرد ایک رسی باندھتے ہوئے بولے "اب تم مجھے نیچے اتار دو"

"مگر آپ کا وزن زیادہ ہے" ان کے ایک کم عمر دوست نے کہا۔

"بہر حال جو کچھ بھی ہو" انکل جو بولے۔

"میرا خیال ہے کہ میں آپ سب میں کم وزن ہوں اس لئے مجھے ہی نیچے اترنا چاہئے" روڈی نے کہا۔

انکل جو بے دلی سے راضی ہو گئے۔

"یاد رکھو" وہ روڈی کو سمجھاتے ہوئے بولے "مائک کو تلاش کرتے ہی اسے مناسب طریقے سے رسی میں باندھ لینا اور جب تم اوپر آنے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکو تو اس کو تین مرتبہ کھینچنا، ہم سمجھ جائیں گے۔"

"جی ٹھیک ہے" روڈی نے کہا۔

"لیکن اگر تم اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہو، یا تم سمجھو کے وہ بہت زیادہ زخمی ہے تو تم اکیلے ہی اوپر آجانا"

پھر انہوں نے مائک کی کمر کے گرد رسی باندھ کر اور اسے ایک لالٹین پکڑا کر آہستہ آہستہ نیچے اتار دیا۔

مائک گہری تاریک فضا میں ادھر ادھر جھولتا ہوا نیچے کی جانب اترتا جارہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے جسم پر کنٹرول کر کے اپنے جسم کی بے ہنگم حرکت کو قابو میں لایا۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا جارہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اس نے اپنی ہمت بڑھانے کے لئے سیٹی بجانی شروع کردی۔ پھر اچانک ہی فضا میں ایک ایسی آواز ابھری جو اسے حیران کر گئی۔

"روڈی ..... یہ تم ہی ہونا؟"

"مائک" روڈی کے منہ سے بے ساختہ نکلا "مائک تم ٹھیک ہونا؟"

یہ کہہ کہ روڈی نے لالٹین کی روشنی میں نیچے دیکھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں مائک کے پیلے پڑے ہوئے چہرے کو دیکھ لیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں لڑکے مٹی کے ڈھیر پر کھڑے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔

"تم ٹھیک تو ہونا" روڈی نے ایک بار پھر پوچھا۔

"بس تھوڑی سی خراشیں آئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں کچھ دیر کے لئے بے ہوش ہوگیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بر وقت آپہنچے ہو میری ٹارچ بے کار ہوگئی ہے۔"

"ٹھیک ہے اب تم رسّی باندھ کر اوپر جاؤ۔ انکل جو اور ان کے دوست اوپر تمہارے منتظر ہیں"

"ایک منٹ ٹھہرو ....." مائک نے کہا "میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔ مگر جب تک ہم انکل جو سے تنہائی میں نہ مل لیں تم کسی سے کچھ مت کہنا"

روڈی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ "یہ بھلا زمین کی اس گہرائی میں مجھے کیا دکھانا چاہتا ہے؟ کہیں اس نے سونا تو نہیں ڈھونڈ لیا؟" روڈی کے ذہن میں کئی خیالات آئے۔

پھر مائک نے لالٹین اٹھائی اور ایک طرف کو چلتے ہوئے بولا "میرے گرنے کے تھوڑی دیر بعد تک ٹارچ کام کر رہی تھی۔ اور جناب ذرا دیکھیں میں نے کیا دریافت کیا ہے؟" مائک ایک طرف کو اشارہ کرتے ہوئے روڈی سے بولا۔

روڈی چند قدم آگے بڑھ گیا اور پھر اس نے مائک کے ہاتھ سے لالٹین لے کر دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟" مائک نے اپنے آگے دیکھتے ہوئے روڈی سے پوچھا

"کیا تمہیں نظر نہیں آرہا" مائک خوشی سے چہکا۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک شے لالٹین کی روشنی میں جھلمل جھلمل کررہی تھی۔

"پانی" ڈوری یکایک پانی کو پہچان کر چلّایا۔ "پانی .... زیرِ زمین ایک بڑی ساری جھیل"

"ہاں" مائک نے کہا "کتنی خوشی کی بات ہے۔ شاید یہ کسی کے لئے فائدہ مند ہو؟ اب ہمیں چلنا چاہئے۔ انکل جو پریشان ہو رہے ہوں گے ہم ان سے آج رات کو کھانے پر اس جھیل کے بارے میں بات کریں گے۔"

"ہاں" روڈی نے کہا۔ اس وقت اس کے ذہن میں بے شمار خیالات اور سوالات آرہے تھے مگر وہ چپ رہا۔

چند لمحوں بعد مائک اور پھر کچھ دیر بعد روڈی اوپر جا پہنچا۔ اسی رات کھانے کی میز پر مائک نے اپنے نیچے گرنے کی تجربات اور اپنی اس قیمتی دریافت کے بارے میں بتایا۔

"جھیل۔ زیرِ زمین جھیل" انکل جو جھیل کے بارے میں سن کر بڑبڑائے "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے جھیل ہی دیکھی ہے"

"ہاں انکل میں نے بھی دیکھی ہے" روڈی نے کہا۔

"اگر اسے استعمال میں لایا جائے تو یہ زمین ایک بار پھر قیمتی ہو جائے گی۔ اور اس کا مطلب ہے کہ مجھے میری زمین کے اچھے دام مل جائیں گے۔ کاش یہ جھیل آج سے بیس سال قبل دریافت ہوئی ہوتی۔" انکل جو یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔ دونوں لڑکے مدھم آواز میں آپس میں کچھ گفتگو کرتے رہے۔ پھر مائک بولا۔

"انکل جھیل اتنے قریب ہے کہ ہم پائپ کے ذریعہ با آسانی چاندی نگر میں پانی لا سکتے ہیں۔ اور نہ صرف چاندی نگر میں بلکہ آراس میں بھی"

"ہاں .... میرا بھی یہی خیال ہے" انکل جو نے کہا۔

"پھر کیا خیال ہے اس آدمی سے نہ مل لیا جائے جس کا کچھ عرصہ پہلے ہم نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوگا۔ بلکہ آپ اپنی زمین اسے ہی فروخت کر دیجئے۔"

"عجیب سا لگے گے۔ اس زمین پر جو مویشیوں کے باڑے کے لئے تھی، پائپوں کا لگنا اور مزدوروں کا کام کرنا عجیب سا لگے گا۔"

انکل جو نے کہا۔

"مگر پانی تو بڑی قیمتی شے ہے" مائک نے اصرار کرتے ہوئے کہا

"اور اگر اپنی زمین اس شخص کے ہاتھ فروخت کر دیں گے تو ایک طرح آپ آراس میں ایک بار پھر خوشحالی لے آئیں گے اور پھر ممکن ہے کہ اس پیسے سے آپ چاندی نگر ہی میں مویشیوں کا ایک نیا جُھنڈ اکٹھا کر لیں۔"

"میں شاید ایسے مویشی زندگی بھر جمع نہ کر سکوں، جیسے میرے پاس کبھی تھے۔" انکل جو نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

پھر ان کے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ پھر مائک نے کہا "اگر آپ اپنی زمین فروخت کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو میں اور روڈی اس شخص کے پاس جا کر اسے اس بارے میں بتا سکتے ہیں۔ اس شخص کا نام رولف ہے اور مجھے اس کے گھر کا پتا معلوم ہے۔ مجھے آپ ہی کے ایک دوست نے بتایا تھا۔ ہم وہاں جانے سے پہلے اس شخص کو خط لکھ کر اپنے آنے کے بارے میں بتا دیں گے۔"

"تم میری زمین فروخت کرنے کے لئے بڑے بے چین ہو" انکل جو نے بدمزہ لہجے میں کہا۔ پھر بولے۔ "ٹھیک ہے لڑکو تم اپنے منصوبے پر عمل کرو۔ اب مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے جانے کے بعد اس زمین کا کیا بنتا ہے۔"

"اور میرا خیال ہے انکل جو کہ اگر آراس میں خوشحالی آ گئی تو آپ بھی خوشحال ہو جائیں گے۔" مائک نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

انکل جو کو اپنی قسمت کی ایسی تبدیلی پر یقین نہیں تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جھیل کی دریافت اور دونوں لڑکوں کے جوش و خروش نے ان پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔

اگلے روز ہی روڈی اور مائک ایک بار پھر گھوڑوں پر سوار ہو کر آراس کی جانب چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ آراس کے آخری سرے پر رولف کے مکان کے سامنے تھے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ رولف کے روبرو تھے۔

"بھئی آپ لوگوں نے مجھے عجیب پراسرار سا خط بھیجا ہے" رولف نے دونوں لڑکوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں آپ لوگ خواہ مخواہ میں تو مجھ سے ملنے کے لئے نہیں آئے"

"آپ ٹھیک سمجھے" روڈی نے کہا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ ایسا کون سا اہم کام ہے جس نے آپ کو ایسا خط لکھنے پر اور پھر مجھ سے فوراً ملاقات کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔" رولف نے کہا۔

"ہم آراس کے بارے میں آپ سے بات کرنے آئے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آپ نے ہم سے ملاقات کے وقت کہا تھا کہ آپ آراس کو ایک بار پھر لوگوں سے بھرا ہوا اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو آراس کی خوشحالی اور رونق بحال کرنے کے لئے پانی کی ضرورت ہے۔ آپ کی اطلاع

کے لئے عرض ہے کہ ہم نے پانی تلاش کرلیا ہے" مائک نے پرجوش انداز میں گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے رولف کو چاندی نگر اور اپنے انکل جو کے بارے میں بتایا۔ اس نے رولف کو انکل جو کے مویشیوں کے ریوڑ کے مرجانے کے بارے میں بھی بتایا اور پھر آخر میں اس نے کان اور اس میں پانی کی جھیل کی موجودگی کے بارے میں رولف کو تفصیل سے معلومات فراہم کیں۔

"جھیل یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں آپ کو جھیل کے پانی سے دلچسپی ہوگی۔ روڈی نے کہا۔

"بالکل! کیوں نہیں؟" رولف نے کہا اسے پانی سے واقعتاً دلچسپی تھی۔ مگر وہ محتاط لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ لڑکوں نے پانی کے بارے میں جو اطلاع دی ہے وہ سچ ہے۔

"اچھا بچّو تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم یہاں آئے اور مجھے یہ ساری باتیں بتائیں۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں چاندی نگر آؤں تو کیا تمہارے انکل مجھے ایک رات کے لئے اپنے یہاں ٹھہرالیں گے؟"

"کیوں نہیں" دونوں لڑکے یک زبان ہو کر بولے "دراصل میں خود وہاں جا کر اس جھیل کو دیکھنا چاہتا ہوں"

رولف نے کہا۔ "کیا وہاں اتنی رسیاں لالٹینیں اور آدمی ہوں گے کہ میں آسانی کے ساتھ نیچے اتر سکوں؟"

"کیوں نہیں جناب، وہاں آپ کو یہ تمام چیزیں میسّر ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلتا ہوں" رولف نے کہا اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر دونوں لڑکوں کے ساتھ چل دیا۔

وہ رات اس نے انکل جو کے گھر پر بسر کی۔ صبح ہوتے ہی وہ مائک روڈی، انکل جو اور کئی اور لوگوں کے ساتھ اس کان پر جا پہنچا جس کے اندر جھیل موجود تھی۔ رولف اور انکل جو نیچے اترے۔ باقی تمام لوگ اوپر ہی رہے۔ رولف اور انکل جو کئی گھنٹوں کے بعد اوپر آئے۔

پھر وہ انکل جو کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر انکل جو اور رولف ایک کمرے میں بیٹھ کر جھیل اور اس سے متعلق معاملات پر غور کرنے لگے۔ روڈی اور مائک اپنے کمرے میں بے چینی کے ساتھ ان کے کسی فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر ہو گئی مگر انکل جو اور رولف کمرے سے باہر نہ نکلے۔ روڈی اور مائک کو تشویش ہونے لگی۔

"لگتا ہے بات بنی نہیں" روڈی نے کہا۔

"ممکن ہے رولف کو جھیل کا پانی اتنا کم لگا ہو کہ وہ اسے خریدنا فائدہ مند نہ سمجھ رہا ہو" مائک نے اپنی رائے دی۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ رولف نے جھیل کے بہت ہی کم دام لگائیں ہوں اور انکل جو کم قیمت پر جھیل کو فروخت کرنے پر راضی نہ ہوں" روڈی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

دوپہر بھی گزر گئی اور دونوں لڑکوں نے اپنا کھانا بھی انکل جو کے بغیر کھایا، لیکن ابھی وہ کھانا ختم ہی کر رہے تھے کہ انکل جو اپنے کمرے سے ٹرے میں گرما گرم کافی اور چار کپ لے کر بر آمد ہوئے۔

"آؤ بچو بیٹھ کر گپ لگائیں" انکل جو نے کہا۔ پھر وہ چاروں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چند لمحے خاموشی سے گزرے، پھر رولف نے گفتگو شروع کی۔

"مائک اور روڈی میں تم دونوں کا بہت شکر گزار ہوں۔ تم دونوں نے ایک بڑی ہی زبردست شے دریافت کی ہے۔ تمہاری دریافت کی ہوئی جھیل نہ صرف یہ کہ بہت بڑی ہے بلکہ اس کی تہہ میں ایک قدرتی چشمہ بھی موجود ہے۔ اب ہم بہت جلدی جھیل سے آراس تک پائپ لائنیں بچھا دیں گے۔ جب تم دونوں پہلی مرتبہ مجھ سے ملے تھے تو میں نے کہا تھا کہ پانی سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ کہا تھا ناں؟ چنانچہ اب میں جھیل کے پانی کو سونے کے داموں خریدنے کو تیار ہوں۔ میں اتنی دیر سے تمہارے انکل کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں یہ زمین خریدنا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف جھیل کے پانی کو استعمال کرنے کا اختیار چاہتا ہوں۔ تاکہ میں جھیل میں پائپ ڈال کر اسے آراس تک لے جا سکوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے انکل چاندی نگر کے باڑے میں اپنے مویشیوں کا ایک نیا ریوڑ رکھ سکتے ہیں۔ میں پانی کی اچھی قیمت ادا کروں گا۔ اور میں تمہارے انکل کو مویشیوں کا ایک بالکل نیا اور عمدہ ترین جانوروں پر مشتمل ریوڑ خرید کر دوں گا۔ ہاں بھئی جو صاحب! آپ کے پرانے ریوڑ میں کتنے مویشی تھے۔" رولف نے انکل جو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور انکل جو کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ .... آپ انکل جو کو مویشیوں کا ایک نیا ریوڑ خرید کر دیں گے۔" مائک نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں بھئی میرا یہی مطلب ہے" رولف نے کہا۔

"اوہ انکل جو" مائک نے سرگوشی میں کہا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر روڈی سے اتنی خوشی برداشت نہ ہوئی اور وہ ہرّے کرتا ہوا اچھل پڑا۔

"چاندی نگر اور آراس ایک بار پھر جی اٹھیں گے۔ اور ایک بار پھر خوشحال ہو جائیں گے۔ مائک خدا کے لئے ذرا جلدی سے میرے لئے کپ میں کافی انڈیلو .... پیاس سے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔"

قیدی

فاروق عادل

ان گلیوں اور محلوں میں رہنے والے بچوں کے
لئے ایک نفسیاتی کہانی جن کے چاروں طرف
اونچے آہنی گیٹ لگا دیئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر حسن نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ کلینک کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئے۔ ہوا تیز تھی اور اس میں ایسا مزا تھا جو سردیوں کے آغاز کی ہوا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے سوچا اب سردیاں آ رہی ہیں کچھ دنوں بعد چھٹیاں لے کر مری جانا چاہئے۔ اس موسم میں مری کا مزا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر انہیں جھرجھری سی آئی جیسے سردی کے احساس سے آیا کرتی ہے اور انہوں نے سرور لینے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اب عالم خیال میں وہ خود کو مری میں دیکھ رہے تھے۔ نامعلوم اسپتال کے گیٹ پر وہ کتنی دیر اسی طرح کھڑے رہتے، لیکن گاڑی رکنے کی آواز پر وہ مری سے واپس اسپتال کے گیٹ پر آ گئے۔

گاڑی کے اگلے دونوں دروازے بیک وقت کھلے اور دو خوش پوش افراد گاڑی سے نکل کر ڈاکٹر حسن کی طرف آئے اور بڑی شائستگی سے ان سے کچھ دیر گفتگو کی۔ ڈاکٹر حسن نے انہیں کلینک کی طرف آنے کا اشارہ کیا اور خود واپس کلینک کی طرف چل دیئے، وہ دونوں افراد جب کلینک پہنچے تو ان کے ساتھ ایک اور فرد بھی تھا۔ عمر میں ان سے زیادہ تھا۔ لیکن شکل میں ان ہی جیسا تھا، ویسا ہی خوش پوش اور باوقار۔ ڈاکٹر نے پہلے والے دونوں افراد کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور بزرگ صورت کو بیٹھنے کو کہا، اور سوال کیا، "فرمایئے؟" بزرگ صورت انسان جنہیں دو خوش پوش افراد بطور مریض لائے تھے، خاموش رہا۔ اور خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر انہیں ساتھ والے کمرے میں لے گئے جہاں کمپیوٹر کے علاوہ اور بہت سے جدید آلات بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر نے مریض کو ایک کرسی پر بٹھایا اور چند آلات ان کے قریب کر دیئے خود ایک ہیڈ فون لگا کر ایک بٹن دبا دیا، ہلکی سی بیپ ہوئی اس کا مطلب تھا، مشین نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے مریض سے گفتگو شروع کر دی، اس کا نام، پتہ، پیشہ، دلچسپیاں اور چند دیگر باتیں دریافت کیں، تھوڑی دیر پہلے گفتگو نہ کرنے والا مریض اب بڑی خوشی سے ہر بات کا جواب دے رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ تک یہ گفتگو جاری رہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے آلات پر آئے ہوئے اعداد شمار کو کمپیوٹر میں فیڈ کر دیا۔ کمپیوٹر کے اسکرین پر تھوڑی دیر تک THINKING کے الفاظ روشن رہے اس کے بعد ایک تحریر آئی۔ "کمپیوٹر کی یادداشت میں اس مرض کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ مریض کے بارے میں ڈاکٹر کا فیصلہ زیادہ مناسب ہوگا۔"

یہ تحریر پڑھ کر ڈاکٹر حسن کی پیشانی کی ہلکی سلوٹیں ذرا گہری ہوگئیں، انہوں نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گویا گہری سوچ میں ہیں اور اٹھ کر مریض کے پاس آگئے اور کہا، "مجھے آپ کے لڑکوں کی بات پر یقین نہیں ہے۔ آپ مجھے بتا دیجئے آپ کو کیا تکلیف ہے۔" مریض نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر حسن مسکرائے اور گھنٹی بجائی، چپراسی اندر داخل ہوا تو انہوں نے اسے چائے لانے کو کہا، چائے کے دوران ڈاکٹر اور مریض میں تناؤ کی کیفیت کچھ کم ہوئی اور ذرا بے تکلفی کی فضا قائم ہوگئی۔ ڈاکٹر نے پھر کہا، "اچھا! آپ مجھے یہ بتا دیجئے کہ آپ یہاں رہنا چاہتے ہیں یا گھر واپس جانا چاہتے ہیں۔" مریض جو ایک عجیب سے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوا اور پھٹ پڑا، "میں آزاد ہونا چاہتا ہوں"

"آپ بالکل آزاد ہیں۔" ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا۔

مریض کو مزید غصہ آگیا اور تلخی سے کہنے لگا، "اچھا! اگر میں آزاد ہوں تو سامنے یہ اونچی آسمان تک دیوار کیوں ہے۔ اس کے اوپر نوکدار سلاخوں والا لوہے کا جنگلہ کیوں ہے۔ اور یہ اس طرف سیاہ گیٹ کیوں ہے۔" اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور بار بار یہ جملہ دہرانے لگا کہ "ڈاکٹر! مجھے اس جیل

سے نکالو۔" یہ صورت حال دیکھ کر ڈاکٹر کو یقین آگیا کہ اس کے دونوں بیٹے درست کہتے تھے کہ ان کے والد کو عجیب مرض نے آگھیرا ہے کہ وہ خود کو ہر وقت اونچی اونچی دیواروں اور مضبوط گیٹ میں بند محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں یہ سب کچھ ان کے بیٹوں نے جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر نے مریض کو اسپتال میں داخل کر کے، خود چھٹیاں لے کر مری نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں اس پیچیدہ مریض سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مریض کئی ماہ تک اسپتال میں داخل رہا۔ ڈاکٹر حسن نے دل لگا کر اس کا علاج کیا لیکن اس کے مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ وہ خود کو بدستور اونچی اونچی دیواروں اور گیٹ میں قید سمجھتا رہا۔ کوئی اور ڈاکٹر ہوتا تو وہ ایسے مریض کو لاعلاج قرار دے کر اسپتال سے فارغ کر دیتا لیکن ڈاکٹر حسن جیسے ہمدرد ڈاکٹر کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ اس مریض کے لئے خاص طور پر مطالعہ کرتے، دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے دماغی امراض کے اسپتالوں اور تحقیقی اداروں سے فیکس کے ذریعے رابطہ کر کے معلومات حاصل کرتے، کئی ماہ تک مسلسل علاج کے باوجود بہتری کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے۔

..... ○ .....

کئی روز کی بارشوں کے بعد آج آسمان صاف تھا اور دھوپ بڑی مزیدار تھی، ڈاکٹر حسن لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بچے کئی روز کے خراب موسم کے بعد اچھا موسم دیکھ کو خوب اودھم مچا رہے تھے، ڈاکٹر حسن نے اخبار تہہ کر کے گود میں رکھا اور بچوں کے کھیل سے محظوظ ہونے لگے، بچے شاید چور سپاہی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ ایک "سپاہی" نے "چور" کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کرنے کے لئے فرضی تالا کھولنے کے لئے ہوا میں چابی گھمائی اور گیٹ دھکیل کر کھولنے اور بند کرنے کی اداکاری کی تو ڈاکٹر چونک اٹھے، ان کے ذہن میں مریض کا چہرہ گھوم گیا جو ہر وقت خیالی دیواروں میں قید رہتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسپتال کا لباس پہنا فوراً مریض کے پاس پہنچے، مریض پہلے کی طرح مایوسی اور غصے کے عالم میں ان دیواروں اور سلاخوں کو گھور رہا تھا جن میں وہ خود کو قید سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر حسن کے ساتھ مریض کا رویہ اب پہلے کی طرح درشت نہیں تھا۔ بلکہ ان دونوں میں کافی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے مریض سے کچھ باتیں کیں، حال احوال پوچھا، پھر دریافت کیا کہ آپ کو اس وقت بھی دیوار میں جنگلے اور سیاہ آہنی گیٹ دکھائی دے رہا ہے مریض نے اقرار میں سر ہلایا ڈاکٹر نے پھر سوال کیا کہ اس گیٹ پر کوئی تالا بھی لگا ہوا ہے۔ مریض نے پھر ہاں میں جواب دیا تو ڈاکٹر مسکرائے، جس پر مریض نے تیوری چڑھا کر پوچھا "اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے، آپ کیوں مسکرائے جا رہے ہیں ؟" ڈاکٹر نے اب ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا کہ اس میں خوشی کی بات یہ ہے کہ اب اس گیٹ کے کھلنے کا وقت آگیا ہے۔ آپ اپنے ہاتھ سے یہ گیٹ کھول کر آزاد ہو جائیں گے، یہ کہہ کر انہوں نے اپنے سفید کوٹ کی دائیں جیب سے چابی نکال کر مریض کو دی اور کہا جایئے تالا کھول کر آزاد ہو جایئے۔ اور خود لان میں ایک بینچ پر بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگے۔ چابی دیکھ کر مریض کی

آنکھوں میں چمک اور چہرے پر رونق آگئی اور وہ بھاگتا ہوا لان کے ایک کونے میں گیا ڈاکٹر کی دی ہوئی چابی سے ایک فرضی تالا کھول کر ایک طرف پھینکا اور فرضی گیٹ کو دھکیل کر باہر نکل گیا۔ اب اس کے چہرے پر مکمل سکون تھا، جیسے اس کے سینے سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ "باہر" نکل کر مریض نے ادھر ادھر دیکھا، زور زور سے سانس لئے جیسے وہ کھلی فضا میں نکل کر یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ واقعی آزاد ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر حسن اس کے پاس گئے اور اسے آزاد ہونے کی مبارکباد دی، مریض ڈاکٹر کے گلے لگ گیا، ان کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر نے مریض کو چائے کی دعوت دی اور اسے اپنے گھر لے گئے۔

چائے پر مریض نے ڈاکٹر سے گھر جانے کی اجازت مانگی ڈاکٹر نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے آپ اب ٹھیک ہو گئے ہیں لیکن مناسب ہے کہ آپ چند روز تک میرے ساتھ رہئے تاکہ دوبارہ آپ کے ساتھ یہی صورت پیش نہ آجائے۔ یہ سن کر مریض کے چہرے کی رونق میں کمی آگئی اور وہ فکر مند ہو گیا، اور پوچھا کہ کیا مجھے ابھی مزید اسپتال میں رہنا ہو گا۔ ڈاکٹر نے مریض کی پریشانی دیکھ کر کہا اب تو ہم دوست ہیں آپ چاہیں تو میرے گھر پر رہ سکتے ہیں، تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد مریض ڈاکٹر کے گھر رہنے پر آمادہ ہو گیا، اب ڈاکٹر حسن زیادہ آسانی سے مریض کا معائنہ کر سکتے تھے اور یہ جان سکتے تھے کہ مریض ایسا کیوں سمجھتا تھا کہ وہ دیواروں اور دروازوں میں قید ہے۔

پہلی ملاقات میں مریض نے ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ وہ بیڈمنٹن کا کھلاڑی ہے وہ اس کے ساتھ روزانہ شام کو بیڈمنٹن کھیلتے، مریض کی ڈاکٹر حسن کے بچوں کے ساتھ بھی دوستی ہو گئی تھی وہ ان کے ساتھ کھیلتا اور انہیں کہانیاں سنایا کرتا۔

ڈاکٹر حسن اسے کہتے "بھئی آپ بچوں کو کہانیوں کا عادی کیوں بنا رہے ہیں، آپ کی طرح مجھے کہانیاں سنانا تو آتیں نہیں، آپ چلے گئے تو بچے مجھے بھی پریشان کریں گے" اس پر وہ مسکرا کر کہتا "ڈاکٹر حسن مجھے بچوں کے درمیان بیٹھ کر سکون محسوس ہوتا ہے ان کے درمیان نہ بیٹھوں تو مجھے پریشان کن خیالات آتے ہیں۔ آپ مجھے ان ہی کے درمیان رہنے دیجئے، ڈاکٹر مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔

ایک شام جب روز کی طرح اس نے بچوں کو پاس بٹھا کر کہانی کا آغاز کیا تو ڈاکٹر حسن کے بڑے بیٹے زاہد نے اسے ٹوک دیا اور کہا "نہیں انکل آج ہم آپ سے جنوں پریوں کی کہانی نہیں سنیں گے۔ کوئی اور کہانی سنائیے، زیادہ دلچسپ اور مزیدار" ڈاکٹر حسن کے دوسرے بچوں شاہد اور احمد نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تو مریض خاموش ہو گیا اور آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے بچوں سے کہا کہ آج میں تمہیں ایک نئی کہانی سناؤں گا..... " اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے دو تین بار کہانی شروع کرنے کی کوشش کی مگر شروع نہ کر سکا۔ بچے اس سے روز یہی کہانی سنانے کی فرمائش کرتے اور وہ ٹال جاتا۔ کیونکہ جیسے ہی وہ کہانی سنانے کا ارادہ کرتا اسے پھر اونچی اونچی دیواریں، لوہے کے

جنگلے اور گیٹ دکھائی دینے لگتے اور وہ پریشان ہو جاتا۔ ایک روز بچوں نے اس سے کہا "انکل! ابو بتاتے ہیں کہ آپ بہت بڑے آرٹسٹ ہیں آپ ہمارے لئے کوئی پینٹنگ کیوں نہیں بناتے" مریض نے وعدہ کر لیا اور دوسرے روز بازار سے سامان لاکر تصویر بنانا شروع کر دی۔ پینٹنگ چند روز میں تیار ہو گئی، پینٹنگ تیار ہوئی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہی اونچی دیواریں، دیواروں پر آہنی جنگلے کی تیز نوکیں اوپر کو ابھری ہوئی ہیں اور سیاہ رنگ کا ایک مضبوط گیٹ، اندر ایک عورت بچے کو گود میں لئے ٹہل رہی ہے، ایک نوجوان بیڈ منٹن کا ریکٹ لئے گیٹ پر باہر نکلنے کا منتظر کھڑا ہے لیکن گیٹ پر ایک مضبوط تالا پڑا ہوا ہے، باہر کچھ لوگ ایک ایمبولینس پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ سڑک خون سے لال ہے اور مکانوں کو آگ لگی ہوئی ہے، آگ سے اٹھنے والے دھویں سے آسمان پر سیاہ بادل بنے ہوئے ہیں۔ وہ گھنٹوں یہ پینٹنگ دیکھتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے ماضی میں پہنچ گیا ہو، جب وہ امی کی انگلی پکڑ کر کمپاؤنڈ میں ٹہلا کرتا تھا۔ وہ باہر نکلنے کے لئے ضد کرتا تو امی اسے گیٹ سے باہر لے جانے کی بجائے گھر لے جاتیں، پھر جب وہ بڑا ہوا تو پتہ چلا کہ گلی والوں نے حفاظت کے لئے یہ گیٹ لگوایا ہے تاکہ موٹر سائیکل پر آکر گولیاں چلانے والے ادھر نہ آسکیں۔ وہ جب مزید بڑا ہو گیا اور کالج جانے لگا تو بھی شام کے بعد اسے گیٹ سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی جاتی، اسے کھیلنے کے لئے جمنازیم جانے سے روک دیا جاتا کیونکہ باہر حالات خراب ہوتے، پھر اسے یاد آیا کہ ایک روز وہ دفتر جانے کے لئے باہر آرہا تھا تو ایک گولی اسے آکر لگی، اسے ایمبولینس میں اسپتال لے جایا جارہا تھا کہ تو ایمبولینس پر بھی فائرنگ ہوئی، اس کے بعد کیا ہوا یہ اسے یاد نہیں تھا۔ اپنی ہی بنائی ہوئی پینٹنگ دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے اس پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوا ہو، اس شام جب بچوں نے اس سے کہانی سننے کی فرمائش کی تو چند روز پہلے کی طرح اس کے سر میں درد نہیں ہوا اس نے پینٹنگ بچوں کے سامنے رکھی اور کہانی شروع کر دی۔ یہ اس کی اپنی کہانی تھی۔

آج کی تازہ خبر

ہاکر اخبار فروخت کر رہا تھا، "آج کی تازہ خبر ایک آدمی نے کھڑے کھڑے انیس آدمیوں کو لوٹ لیا حیرت انگیز خبر۔"

ایک آدمی وہاں سے گزر رہا تھا اس نے یہ سنا تو فوراً اخبار خرید لیا۔ لیکن اسے اخبار میں اس قسم کی کوئی خبر نظر نہیں آئی اس نے غصے سے ہاکر کی طرف دیکھا مگر ہاکر اس سے بے نیاز آواز لگا رہا تھا "آج کی تازہ خبر ایک آدمی نے کھڑے کھڑے بیس آدمیوں کو لوٹ لیا"۔

مرسلہ گلشن کمل پروانہ ...... مستونگ

جادوئی آنکھ

ساجد سعید

دوسری عالمی جنگ پورے زوروں پر تھی اور گرد و پیش میں گرد و غبار کے بادل اٹے ہوئے تھے جرمنوں کے برقی لہروں سے چلنے والے جہاز مسلسل کئی دنوں سے برطانیہ کی آبادیوں پر اندھا دھند بم برسا رہے تھے اور دوسری طرف سے بلجیم اپنے راکٹ بموں کی بارش کر رہا تھا اس صورتحال کے پیش نظر برطانیہ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کس طرح ان بموں اور جہازوں کا وقت سے پہلے پتا لگا کر لوگوں کو باخبر کیا جائے چنانچہ انہوں نے بڑی سوچ بچار اور تجربوں کے بعد ایک جادوئی آنکھ ایجاد کی جو تین چار سو میل کے دائرے میں کہر اور دھند کے بادل کے باوجود رات اور دن میں کسی بھی وقت دشمن کے جہاز یا آبدوز کا پہلے پتا لگا کر ہمیں باخبر کر دیتی ہے اس کا انگریزی میں نام "ریڈیو ڈی ٹیکشن اینڈ رینجنگ" ہے جس کا مطلب ہے ریڈیائی لہروں سے کسی چیز کا کھوج لگانا اور اس کی سمت معلوم کرنا۔ جی ہاں آپ نے صحیح پہچانا یہ جادوئی آنکھ دراصل ریڈار ہے جس سے دور کی چیزوں کا با آسانی پتہ لگایا جاسکتا ہے اور ان کا درمیانی فاصلہ با آسانی فوری طور پر معلوم کیا جاسکتا ہے۔ یہ آلہ اس وقت کار آمد ثابت ہوتا ہے جب کہر یا بادل کی وجہ سے دور دراز کی چیزیں صاف طور سے دکھائی نہ دے رہی ہوں۔

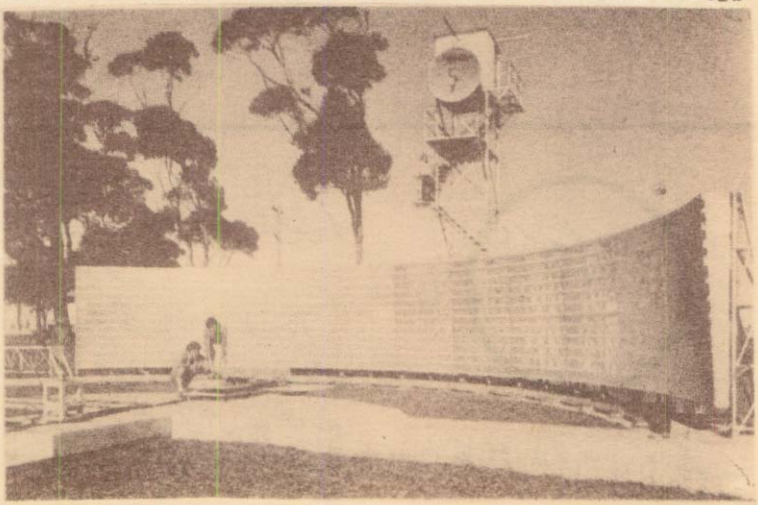

ریڈار ریڈیائی لہروں کے اصول پر کار بند رہتا ہے آپ نے ریڈیو کے ٹرانسمیٹر تو ضرور دیکھا ہو گا جس کو آلہ ترسیل بھی کہا جاتا ہے یہ ہماری آواز کو لہروں میں تبدیل کر کے دور دور تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح ریڈار کا بھی ایک ٹرانسمیٹر ہوتا ہے جس کی طاقت دس کلو واٹ سے دو سو کلو واٹ تک ہوتی ہے بعض کی ہزار کلو واٹ تک ہوتی ہے ریڈار کے ٹرانسمیٹر میں جتنی طاقت ہوگی وہ اتنی ہی زیادہ دور کی خبر دیتا ہے۔ ریڈار میں ایک مشین ہوتی ہے جو طاقتور شعاعوں (ریڈیائی لہروں) کو چاروں طرف فضا میں بکھیرتی اور منتشر کرتی ہے ہم حسبِ ضرورت ان شعاعوں کو ایک شعلے کی شکل میں ایک خاص سمت (Direction) میں بھیج سکتے ہیں جب ریڈیائی لہروں کو دشمن کے جہاز کا پتہ لگانے کے لئے آگے پھینکا جاتا ہے تو یہ لہریں آگے جاکر مطلوبہ جسم سے ٹکراتی ہیں وہ جسم بجلی کا اچھا موصل (Good Conductor) ہوتا ہے اس کے بعد وہ اس جسم سے ٹکرا کر واپس آتی ہیں ان لہروں کو ایک ریڈیائی آلہ جو ٹرانسمیٹر کے قریب ہوتا ہے وصول کرتا ہے اور آخر کار اس ریڈیائی آلہ میں ارتعاش نگار، اس جسم کی شکل کو ایک خاص پردے پر نمایاں کر دیتا ہے۔ یہ شعاعیں جب کسی ٹھوس جسم سے ٹکراتی ہیں تو وہ ہلکے چھپکے اس کی تصویر کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ ریڈار میں استعمال ہونے والی ریڈیائی لہروں کا وقت بہت قلیل ہوتا ہے یعنی ۱ء۰ مائیکرو سیکنڈ سے تیس مائیکرو سیکنڈ تک اور تقریباً ایک سیکنڈ میں اس میں سے ساڑھے تین سو سے دس ہزار تک لہریں خارج ہوتی ہیں۔ اب باقی مسئلہ رہا فاصلہ جاننے کا تو شعاعوں کا مشین سے نکلنے اور تصویر لیکر واپس آنے کا وقت مشین چلانے والے کو معلوم ہوتا ہے اور اس کی رفتار بھی اس کو معلوم ہوتی ہے پس وہ لمحہ بھر میں دشمن کے جہاز یا آبدوز کے فاصلے کا اندازہ کر لیتا ہے۔ یہ بات بھی سائنس دانوں کے لئے حیرت سے کم نہ تھی کہ ریڈار میں جن شعاعوں سے کام لیا جاتا ہے ان کا پرندوں اور جانوروں سے اخراج ہوتا ہے جیسے مثال کے طور پر آپ چمگادڑ ہی کو لے لیجئے کہ وہ رات کی تاریکی میں اڑتے وقت کسی بھی کھمبے اور دیوار سے نہیں ٹکراتا جس کی وجہ اس کے جسم سے نکلنے والی ہی شعاعیں ہوتی ہیں جو اس کو قبل از وقت رکاوٹ کا پتہ دے دیتی ہیں اسی اصول کے تحت بعد میں سائنس دانوں نے بینائی سے محروم لوگوں کے لئے ایسی چھڑی بنائی جو ان کو راستے میں چلتے وقت رکاوٹ کی بروقت خبر دے دیتی ہے جب کوئی چیز ان لوگوں کے راستے میں آنے لگتی ہے تو اس چھڑی میں گھنٹی بجنے لگتی ہے اور اس وقت تک بجتی رہتی ہے جب تک وہ محفوظ جگہ پر نہ ہو جائیں۔

اسی وسیع و عریض دنیا میں انسان اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کیسی کیسی چیزیں ایجاد کر رہا ہے جن کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے یہ ایجادات انسان کی کوئی نہ کوئی ضرورت پورا کر رہی ہیں اسی طرح ریڈار کی شعاعیں جنگ و امن کے زمانے میں بادل اور اندھیرے کے باوجود بھٹکے طیاروں اور آبدوزوں کو راستہ

دکھانے کا کام سرانجام دیتی ہیں۔ جنگ کے زمانے میں ریڈار کو دشمنوں کے طیاروں اور بحری جہازوں کی موجودگی کا پتہ لگایا جاتا ہے اور آبدوزوں کو تلاش کیا جاتا ہے اسی طرح دشمن پر بمباری کرتے وقت ریڈار کو شہر کا محل وقوع معلوم کرنے کے لئے بھی کام میں لایا جاتا ہے۔

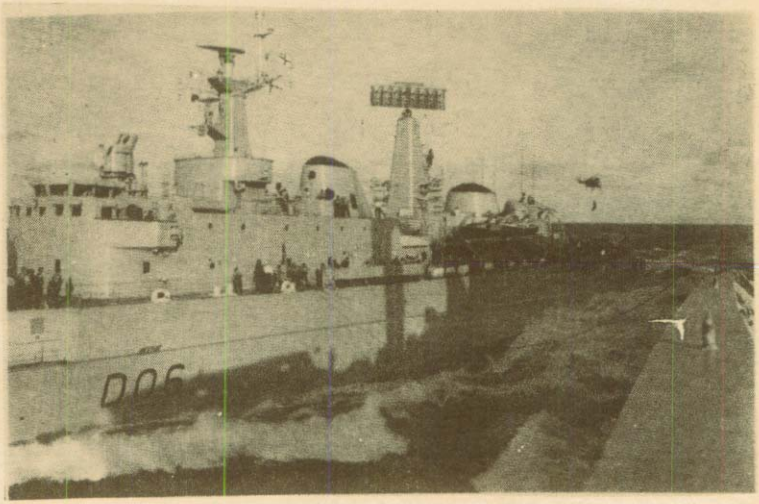

اگر ریڈار ایجاد نہ ہوتا تو دشمنوں کے اچانک حملوں سے بچنے کے لئے قبل از وقت اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کیا صورت ہوتی اور طیاروں کو وقت پر خطرات سے کیوں کر آگاہی حاصل ہوتی۔ یہ بات حقیقت ہے کہ سائنس نے جہاں بنی نوع انسان کے لئے تباہی کے بہت سے سامان پیدا کئے ہیں وہاں دوسری طرف اس نے انسانوں کو بے شمار سہولتیں بھی فراہم کی ہیں۔

فوجی! لنگر میں کھانا کھانے لگے تو کمپنی کمانڈر نے آکر پوچھا! "جوان کھانا کیسا ہے" کوئی شکایت تو نہیں؟

سر! آپ خود کھا کر دیکھ لیں سالن باسی ہے ایک جوان نے کہا! کمپنی کمانڈر نے کہا کہ "یہ کھانا اگر نپولین کی فوج کو ملتا تو وہ ساری دنیا فتح کر لیتی"

سر اس وقت یہ تازہ تھا۔

مرسلہ اعزاز حسن۔ اسلام آباد

ہر طرف تھا اِک قیامت کا سماں
پمپئی میں جب پھٹا آتش فشاں

سلمیٰ اسلیم

اگر آج سے دو ہزار سال قبل اخبارات اور ٹیلی ویژن موجود ہوتے تو وہ دنیا بھر کو اٹلی میں پھٹنے والے آتش فشاں کی ہولناک کہانی ضرور سناتے۔ اس آتش فشاں سے نکلنے والے لاوے نے پرفضا مقام ہرکولینیم اور ساحلی شہر پمپئی کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا تھا۔

اس سانحے کا آغاز ۲۴ اگست کو دوپہر کے قریب ہوا۔ اچانک ویسوویس نام کے پہاڑ میں زور دار دھماکہ ہوا اور دھماکے سے اڑنے والی گرد نے بادل کی صورت اختیار کر کے سورج کو ڈھانپ لیا۔

پوری زمین کانپ کر رہ گئی۔ آتش فشاں پہاڑ سے چھ کلو میٹر دور واقع شہر پمپئی میں لاوے کی راکھ اور پتھر گرنے لگے۔ یہ عمل کوئی اٹھارہ گھنٹے تک جاری رہا۔ لوگ خوفزدہ ہو کر گھروں سے بھاگ نکلے۔ کوئی میدانی علاقوں کی طرف بھاگ رہا تھا، کوئی ساحل کی طرف۔ جبکہ کچھ لوگوں نے خود کو اپنے گھروں میں قید کر لیا تھا۔

چند ہی گھنٹوں بعد پمپئی کی گلیوں میں لاوے کی چھ فٹ موٹی تہہ جم چکی تھی جس کے باعث بھاگ نکلنے میں دیر کرنے والوں کے لئے جان بچانے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی۔ چند گھنٹوں کے بعد

پمپئی کی کھدائی سے برآمد ہونے والی ماں اور اس کا بچہ۔

پمپئی میں سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طوفانی زہریلی ہوائی چلنے لگیں۔ اور یوں بچا کچھا شہر بھی تباہ ہو کر رہ گیا۔ تین دن کے بعد جب یہ سارا عمل رکا تو شہر کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔

اس کے بعد پمپئی صدیوں تک ایک بھولی بسری یاد کے طور پر لاوے کے اندر دبا رہا۔ ۱۷۰۰ میں ایک انجینئر نے لاوے کو کھود کر پمپئی کی کچھ عمارتیں دریافت کیں۔ اس دریافت کے ساتھ ہی خزانوں کے متلاشی وہاں آپہنچے۔ اس کے بعد ماہرین ارضیات اور سائنس دان آئے جو وہاں کی طرز زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ۱۸۴۰ میں پمپئی کی سائنسی بنیادوں پر کھدائی شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ سارا شہر دریافت کرلیا گیا۔ پمپئی کی دیواروں پر ابھی تک مختلف مہموں کے نعرے غلاموں کی خرید و فروخت کے اشتہارات اور کھوئی ہوئی اشیاء کے نوٹس موجود تھے۔ ایک بیکری سے ۸۱ جلی ہوئی ڈبل روٹیاں بھی برآمد ہوئیں۔

شہر سے بہت سے جلے ہوئے لوگوں کے اجسام بھی برآمد ہوئے۔ گرم راکھ نے ان لوگوں کو مختلف مقامات پر دبایا ہوا تھا۔ راکھ کے اندر بعض انسانی جسموں کے سانچے کے نشانات بھی موجود تھے۔ یہ وہ نشانات تھے جو انسانی جسموں کے راکھ بن جانے کے بعد بن گئے تھے۔

پمپئی سے دریافت ہونے والی عمارتیں اور اشیاء ہمیں پمپئی کے طرز زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہیں۔ ابھی تک پمپئی کا پچیس فیصد حصہ کھودا نہیں جاسکا ہے۔ توقع ہے کہ اس حصے کو کھودنے میں ابھی مزید سو برس لگیں گے۔ شاید آپ میں سے بہت سے لوگ پمپئی کی پوری دریافت کی خبر پڑھیں۔ شاید!

تصویرِ حیرت

پومپائی کا آتش فشاں جس نے
گوشت پوست کے انسانوں کو
پتھر کا دائمی مجسمہ بنا دیا۔

گرین لینڈ کی سیلیں

سید عرفان علی یوسف

"اس جزیرے کو گرین لینڈ کیوں کہا جاتا ہے؟" ذیشان نے چلتے چلتے سوال کیا۔ "شاید اس لیے کہ یہ جزیرہ سبز نہیں ہے۔" عدنان نے کہا۔ "یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔" ذیشان بولا۔ "اصل بات یہ ہے۔" عدنان نے کہا۔ "آج سے ایک صدی قبل ڈنمارک کے باشندے اس

جزیرے پر آئے اور اسے اپنے ملک کا حصہ بنا لیا۔ ڈنمارک کی حکومت کی خواہش تھی کہ یہ جزیرہ پوری

یا "بے آباد جزیرہ" رکھ دیا جاتا تو لوگ اس جزیرے کا رُخ کرتے ہوئے ہچکچاتے۔ اس لیے اس جزیرے کا نام گرین لینڈ رکھ دیا گیا۔"

"لیکن یہ جزیرہ سرسبز تو ہے نہیں اس لیے یہ نام غلط ہے۔" ذیشان نے کہا۔

"یہ جزیرہ بالکل بے آب و گیاہ بھی نہیں ہے۔" عدنان نے بتایا۔ "یہ درست ہے کہ گرین لینڈ کا بڑا حصّہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور برف کی یہ تہہ گیارہ ہزار فٹ موٹی ہے۔ اگر تم اس برف کو کھودنا شروع کرو تو صرف ایک میل نیچے ایسی برف ملے گی جو ایک ہزار سال پرانی ہوگی۔ یہ برف کبھی نہیں پگھلتی ماسوا اس کے کہ موسمِ گرما میں اُوپر کی برف تھوڑی سی نرم ہو جاتی ہے۔ اس برف کی موٹائی میں بستقل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ آج سے دس ہزار سال بعد اس مقام پر برف کا عظیم پہاڑ ہوگا۔"

"بھائی جان" ذیشان بولا "گرین لینڈ کے بارے میں اتنی معلومات فراہم کرنے کا بہت شکریہ۔ لیکن دس ہزار سال بعد میرا اس برف کے پہاڑ پر آنے کا کوئی ارادہ نہیں اور میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ گرین لینڈ کا نام بدل کر "نو مینز لینڈ" رکھ دینا چاہیے۔

"بھئی تم بلاوجہ اس نام کے دشمن ہو رہے ہو۔" عدنان نے کہا "گرین لینڈ کے پورے مغربی ساحل پر کوئی پچاس میل سے لے کر ایک سو میل تک چوڑی پٹی ہے جو سبزے سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہ کوئی گھنا جنگل نہیں ہے۔ یہاں کوئی درخت یا پودا دس فٹ سے اونچا نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں درجنوں قسم کے پھولدار

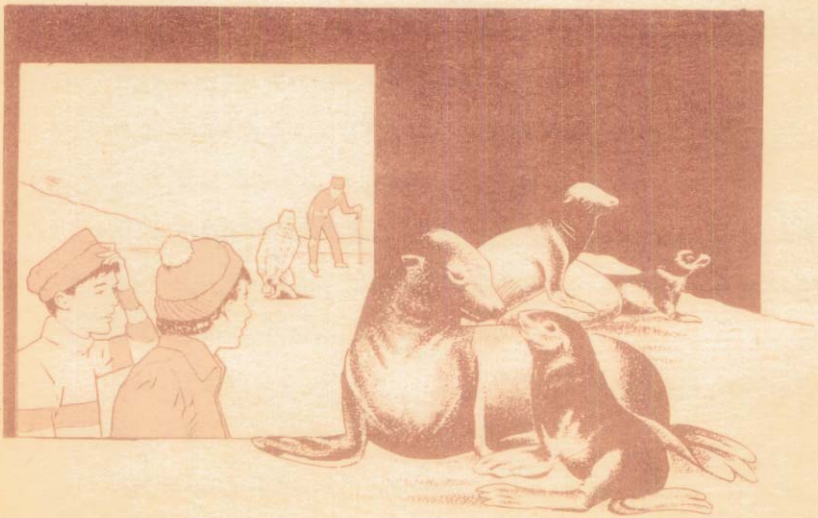

اور پھل دار درخت اور پودے ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ جگہ قطب شمالی سے بے حد نزدیک ہے اس لیے یہاں سخت سردی پڑتی ہے اور درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔"

"مجھے اس بات پر اُس وقت یقین آئے گا جب میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔" ذیشان نے کہا۔ "لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ گرین لینڈ کے مغربی ساحل پر تو سبزہ ہے لیکن باقی علاقہ کیوں بنجر اور بے آب و گیاہ ہے؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ گرم پانیوں کا ایک دھارا خلیج میکسیکو سے اس ساحل پر ٹکراتا ہے۔ میکسیکو کے گرم خطّے سے آنے کے باوجود یہ پانی یہاں پہنچتے پہنچتے زیادہ گرم نہیں رہ جاتا، لیکن پھر بھی اس کا درجۂ حرارت صفر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی ساحل کے مقابلے میں یہاں مار ڈالنے والی سردی نہیں ہوتی اور اسی بنا پر یہاں انسانی آبادیاں اور سبزہ ہے۔"

ذیشان خاموش رہا۔ اس کے سوال اب ختم ہو گئے تھے اُس کے بڑے بھائی عدنان کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ذیشان نے نیا سوال داغ دیا: "یہاں رات کو اتنا زیادہ اندھیرا کیوں ہوتا ہے؟"

"کیونکہ یہاں سردیوں کا موسم ہے" عدنان نے کہا: "یہاں پورے موسمِ سرما میں سورج دکھائی نہیں دیتا اس لیے گہری تاریکی رہتی ہے۔ موسمِ گرما میں سورج دن رات چمکتا رہتا ہے اس لیے کبھی اندھیرا نہیں ہوتا۔ اگر تم اپنی گھڑی میں وقت نہ دیکھو تو یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ دوپہر کا وقت ہے یا آدھی رات کا۔"

"لیکن میرے پاس تو گھڑی ہے۔" ذیشان نے کہا۔

"پھر بھی وقت کا تعیّن اتنا آسان نہیں ہے۔" عدنان بولا: "فرض کرو کہ تمہاری گھڑی میں دس بجے ہیں۔ اب تم اس کا فیصلہ کیسے کرو گے کہ دن کے دس بجے ہیں یا رات کے؟"

"اچھا! اگر یہ سردی کا موسم ہے تو اس وقت بالکل اندھیرا کیوں نہیں ہے یہ تو صرف جھٹ پٹے کا سماں ہے۔ کیونکہ یہ سرمائی دن کا وقت ہے۔ سورج طلوع ہونے کے قریب ہے۔ چند دن کے بعد سورج طلوع ہو جائے گا۔ اس لیے اس وقت گہری تاریکی نہیں ہے۔"

"بہرحال" ذیشان ہنس کر بولا "یہ صبح کا وقت ہو یا شام کا۔ میرے قطبی ریچھ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ہر وقت بھوکا رہتا ہے۔ اور مجھ سے کھانا مانگتا رہتا ہے۔"

ذیشان اور عدنان کے والد دُنیا کے مختلف چڑیا گھروں اور عجائب گھروں کے لیے جانور پکڑتے تھے۔ ذیشان اور عدنان اس کام میں اُن کی مدد کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کو جانوروں سے بے حد

محبّت تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جانور بھی اُن سے جلدی مانوس ہو جاتے تھے۔ آج کل دونوں بھائی قطبِ شمالی کے علاقے کے جانور پکڑنے کے لیے اس علاقے میں گھوم رہے تھے۔ بہت سے اسکیمو باشندے بھی اُن کے دوست بن چکے تھے۔ ذیشان نے ایک قطبی ریچھ کا بچّہ پکڑ کر پال لیا تھا۔ یہ ریچھ اُن سے خوب مانوس ہو گیا تھا۔ اور مختلف کاموں میں اُن کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔ چونکہ اُسے دن میں کئی مرتبہ خوراک مل جاتی تھی اس لیے وہ دن کا کافی وقت سو کر گزارتا تھا۔ آلریک ایک نوجوان اسکیمو تھا جو ان کا مشترک دوست تھا۔ وہ بھی جانوروں کو پکڑنے میں ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ اس مرتبہ ان کا پروگرام مختلف قسم کی قطبی سیلیں پکڑنے کا تھا۔ اُن کے والد نے اپنے خط میں لکھا تھا "جتنی زیادہ تعداد میں قطبی سیلیں پکڑ سکتے ہو پکڑ لو۔ خاص طور پر داڑھی دار سیل جو بارہ فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ اس کا اوسط وزن آٹھ سو پاؤنڈ تک ہوتا ہے لیکن اس سیل کے جبڑوں سے دُور رہنا کیونکہ اس کے دانت اتنے تیز ہوتے ہیں کہ وہ کسی بھی انسان کی گردن کاٹ کر اُس کا سر دھڑ سے جُدا کر سکتی ہے۔ اسکیمو اس سیل کو "مکلوک" کہتے ہیں۔"

قطبی سیلیں سمندر پر بچھی ہوئی برف کی تہہ کے نیچے رہتی ہیں۔ سانس لینے کے لیے وہ برف کی تہہ میں سوراخ بنا لیتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس سوراخ سے منہ باہر نکال کر تازہ ہوا لیتی ہیں۔

"ہم ایک آٹھ سو پونڈ وزنی سیل کو چھ انچ چوڑے سوراخ سے باہر نہیں کھینچ سکتے۔" عدنان نے کہا۔

"اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے۔" ذیشان بولا۔ "آکسیجن ٹینک اور نیوپرین کا لباس پہن کر پانی کی تہہ میں جایا جائے۔ نیوپرین کا لباس جسم کو گرم رکھے گا۔"

چنانچہ انھوں نے غوطہ خوری کا سامان لیا اور سمندر کی طرف روانہ ہو گئے۔ عدنان نے دیکھا کہ ذیشان کا پالتو ریچھ بھی اُن کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"اسے واپس کر دو۔" عدنان نے کہا۔

"کرنے سے کہنا آسان ہے۔" ذیشان بولا۔ "اسے اس کی مرضی کے خلاف واپس نہیں بھیجا جا سکتا۔"

"تم بات نہیں سمجھ رہے۔" عدنان نے کہا۔ "سیل قطبی ریچھ کی مرغوب غذا ہے۔ اگر وہ ہمارے ساتھ پانی میں کود گیا تو سیلوں کو پکڑ کر کھانا شروع کر دے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم اسے تعلیم دے سکتے ہیں۔" ذیشان بولا۔

"اس کے علاوہ آٹھ سو پاؤنڈ وزنی سیل کو پکڑنے میں وہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

آلریک نتھوئے کے قریبی قصبے کی طرف چلا گیا تاکہ پکڑی ہوئی سیلوں کو لے جانے کے لیے ٹرک کرائے پر لے سکے۔ عدنان نے اُسے ہدایت دی کہ وہ چند مزدوروں کو بھی ساتھ لے آئے۔

دونوں بھائی سخت برف پر چل رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں انہیں سیل کا ایک سوراخ نظر آیا۔ دونوں سوراخ کے پاس بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔ ان کی معمولی سی حرکت بھی سیل کو خبردار کر سکتی تھی۔ کافی دیر انتظار کے بعد سیل کا سیاہ سر سفید سوراخ سے باہر نکلا۔ یہ ایک چھوٹی سیل تھی۔ اس کے چھ فٹ لمبے باپ کے مقابلے میں اُسے قابو کرنا نسبتاً آسان تھا۔ ان کا پالتو ریچھ سیل کو دیکھتے ہی آگے بڑھا۔ سیل کا مزیدار ناشتہ اُس کے سامنے تھا۔ لیکن ذیشان نے اُسے روک دیا۔ وہ کسی پالتو گائے کی طرح پیچھے ہٹ گیا۔ دونوں بھائیوں نے آسانی سے سیل کو قابو کر کے ایک تھیلے میں ڈال دیا۔ ریچھ کے لیے یہ پہلا سبق تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسری سیل پکڑی گئی۔ ریچھ نے اس پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے روک دیا گیا۔ ایک گھنٹے کے عرصہ میں انہوں نے تین سیلیں پکڑلیں۔ ریچھ اُن کے حکم کی پُوری طرح تابعداری کرتا رہا۔

دونوں بھائی اب غوطہ خوری کا لباس پہن کر پانی میں کُودنے کے لیے تیار تھے۔ ان کے پالتو ریچھ پر بھی بھروسہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اُن کے پکڑے ہوئے شکار کی نرم کھال میں دانت گاڑنے کے بجائے ان کی مدد کرے گا۔

قطبی ریچھ ایک بہترین تیراک ہوتا ہے۔ وہ چھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تیر سکتا ہے اور بغیر آرام کیے ایک سو میل تک تیراکی کر سکتا ہے۔ تیراکی میں کوئی دوسرا ریچھ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قطبی ریچھ آٹھ سو پونڈ وزنی داڑھی دار سیل کو ایک ہی تھپڑ میں ہلاک کر سکتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں آلریک ایک بڑے ٹرک کے ساتھ ساحلِ سمندر پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ چھ سات مزدور بھی تھے۔ "میری خواہش تھی کہ میں بھی تمہارے ساتھ سمندر میں جاتا۔" آلریک نے کہا۔ "لیکن میرے پاس غوطہ خوری کا سامان نہیں ہے لیکن تم سمندر میں ایک اور بڑے جانور کا خیال رکھنا جس کا نام "اُوگ جوک" ہے۔"

"میں نے یہ نام کبھی نہیں سُنا۔" عدنان نے کہا۔

"یہ ایک بڑی سیل ہے۔ یہ گہرائی میں ایک بیلے ڈانسر کی طرح رقص کرتی ہوئی نظر آئے گی۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے والد بھی اس کے بارے میں نہ جانتے ہوں، لیکن یہ ایک بڑی سیل ہے جس کی کئی ہزار پاؤنڈ قیمت ہوگی۔"

"اچھا ٹھیک ہے تو ہم "اوگ جوک" اور "مکلوک" کی تلاش میں جا رہے ہیں۔" عدنان بولا۔

اگرچہ موسمِ گرما شروع ہو رہا تھا لیکن سمندر کی سطح پر ابھی کافی مقدار میں برف تھی، لیکن درمیان

میں پانی کی ایک چوڑی پٹی بھی تھی اور یہاں سے دونوں بھائی غوطہ خوری کر سکتے تھے۔ انہوں نے غوطہ خوری کا لباس پہنا اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اُن کا پالتو ریچھ بھی اُن کے پیچھے پانی میں کُود گیا۔ سطح کے نزدیک والا پانی آبی خلیات پلانکٹون کی کثرت سے گدلا ہو رہا تھا۔ پلانکٹون ایسے آبی حیوانات ہیں جو دبیل کی خوراک ہیں۔ کوئی تیس فٹ نیچے جا کر پانی شیشے کی طرح صاف اور شفاف ہو گیا۔ پانی کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کے قریب تھا لیکن نیوپرین کا لباس پہننے کی وجہ سے اُنہیں سردی نہیں لگ رہی تھی۔

سیلوں کے چھوٹے چھوٹے بچے ان مہمانوں میں بے حد دلچسپی لے رہے تھے۔ اور ان کے آس پاس تیر رہے تھے۔ وہ اُن کے قریب آتے اور اُن کے ہاتھوں کو چھُو کر دیکھتے اور پھر تیرتے ہوئے دُور ہو جاتے۔ عدنان نے اپنی ٹارچ روشن کر لی۔ کیونکہ اُنہیں اب زیادہ دُور تک دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت تھی۔ رنگ برنگی مچھلیاں اُن کے آس پاس تیر رہی تھیں۔ سمندر کی تہہ میں رنگین سیپیوں، کیکڑوں، صدفیوں اور دوسرے سمندری جانوروں کی بہتات تھی۔ اچانک اُنہیں بے حد خوبصورت سیل نظر آئی۔ اس نے بے حد لاپرواہی سے ان اجنبیوں کو دیکھا اور دوسری طرف متوجہ ہو گئی عدنان نے رسّی کا پھندا اُس کی طرف پھینکا جو اُس کے سر اور پنکھ کے درمیان جا کر پھنس گیا۔ اب دونوں بھائیوں نے اُسے کھلے اور برف سے صاف سمندر کی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ جلد ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ چار سو کلو وزنی اس لحیم شحیم سیل کو کھینچنا اُن کے بس سے باہر ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اُس کو کھینچتے۔ سیل اُنھیں کھینچ کرلے جا رہی تھی۔ اُس کے چپّوؤں جیسے پنکھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔

ذیشان کو یاد آیا۔ اِس وقت صرف اُن کا پالتو ریچھ ہی اُن کی مدد کر سکتا تھا۔ اُس نے ریچھ کو تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن وُہ آس پاس کہیں نہیں تھا۔ وہ چونکہ غوطہ خوری کا لباس پہنے ہوئے نہیں تھا اس لیے سانس لینے کے لیے بالائی سطح کی طرف گیا ہوا تھا۔ بالآخر وہ دوبارہ نیچے واپس آیا۔ اُس وقت لحیم شحیم سیل عدنان اور ذیشان کو کھینچ کرلے جا رہی تھی۔ اُن کا پالتو ریچھ غوطہ لگا کر اُن کے قریب آیا تو عدنان نے رسّی کا سرا اُس کے دانتوں میں دے دیا۔ رسّی تن گئی اور ریچھ کھُلے پانی کی طرف تیرنے لگا۔ سیل بے بسی سے اپنے چپّو نما پنکھ ہلا رہی تھی۔ ذرا دیر میں وہ سب ساحل پر پہنچ گئے۔ ریچھ نے سیل کو ساحل پر پٹخ دیا۔

"زندہ باد نینو"۔ ذیشان نے ریچھ کو تھپکتے ہوئے کہا اور ریچھ نے محبت سے بالوں بھرا منہ

ذیشان کے منہ پر لگا دیا۔

اب انھوں نے دوسرے مزدوروں کی مدد سے سیل کو ٹرک میں ڈال دیا۔

"اچھا، اب تم لوگ بھی ٹرک میں چڑھ جاؤ" آلریک چلّا کر بولا۔

"ابھی نہیں" عدنان بولا "ابھی ہمیں وہ سیل بھی پکڑنی ہے جو "اوگ جوک" کہلاتی ہے اور پانی میں سی بیلے ڈانسر کی طرح رقص کرتی ہے"

وہ سب مزدوروں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کا پالتو ریچھ اُن کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ سمندر کا ساحل اور سفید برف ہزاروں سیلوں سے پٹی پڑی تھی۔ یہ سیلیں پانی میں اور پانی کے کنارے اس طرح پڑی ہوئی تھیں جیسے پاکستان کے کسی دیہات میں جوہڑوں اور تالابوں میں بھینسیں پڑی رہتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں انہیں "اوگ جوک" بھی نظر آ گئی۔ جب اُس نے اتنے سارے انسانوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو ساحل سے پانی کی جانب دوڑی۔ لیکن وہ اتنی موٹی تھی کہ دوڑ میں آدمیوں اور ریچھ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے آسانی سے اُسے جالیا اور رسیوں سے باندھ دیا۔ اُن کے ریچھ نے بھی اُن کی پوری پوری مدد کی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹرک کے ذریعے نتھوے کے ہوائی اڈے کی طرف جا رہے تھے۔ ٹرک پچھلے حصّے میں سیلیں بند تھیں اور آگے وہ سب بیٹھے ہوئے تھے ایک اسکیمو ٹرک چلا رہا تھا۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی" ذیشان بولا "کیا یہ سیلیں ہوائی جہاز میں مر نہیں جائیں گی۔ کیونکہ جہاز میں پانی نہیں ہوگا"

"انھیں کچھ بھی نہیں ہوگا" عدنان نے کہا "آج سے ہزاروں سال پہلے یہ سیلیں خشکی کا جانور ہی تھیں اور اب بھی ہیں۔ کیونکہ ان کے جسم میں مچھلیوں کی طرح گلپھڑے نہیں ہیں۔ اس لیے وہ پانی سے آکسیجن حاصل نہیں کر سکتیں۔ اسی وجہ سے اُنہیں سانس لینے کے لیے پانی کی سطح پر آنا پڑتا ہے۔ وہ پانی میں صرف اس لیے جاتی ہیں کہ اُنہیں وہاں خوراک ملتی ہے۔ تمہیں الاسکا کی گلیشئر خلیج یاد ہے نا؟"

"جی ہاں" ذیشان بولا۔

"تم نے وہاں کیا دیکھا تھا؟"

"ہزاروں سیلیں جو برف کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر بیٹھی رہتی تھیں"

"قطعی یہی بات ہے" عدنان نے کہا "وہ اپنا زیادہ تر وقت پانی سے باہر ہی گزارتی ہیں، اسی طرح اوریگن کے ساحل پر تو نہ برف تھی اور نہ چٹانیں۔ کیونکہ زمین اور سمندر سیلوں سے ڈھکا ہوا تھا"

"اس کا مطلب یہ ہوا۔" ذیشان بولا "کہ جب یہ سیلیں ہمارے فارم میں پہنچ جائیں گی تو ہم ان کو چٹانوں پر بیٹھے ہوئے دیکھیں گے۔"

"بالکل، ایسا ہی ہوگا۔" عدنان نے کہا۔

فضا دھندلی ہو رہی تھی۔ دُور سے ہوائی اڈّے کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ چونکہ یہ سرمئی رات کے آخری دن تھے۔ اس لیے یہاں سارے دن روشنیاں جلتی رہتی تھیں۔ تاکہ طیارے آسانی سے نیچے اُتر سکیں۔ یہیں وہ جہاز بھی موجود تھا جس سے اُن کی پکڑی ہوئی سیلوں کو اُن کے مُلک جانا تھا۔

●

محنت کی عظمت

امان اللہ نیر شوکت

کامیابی مل نہیں سکتی مشقت کے بغیر
نامور ہوتا نہیں کوئی بھی محنت کے بغیر
جس نے کی محنت ملی ہے عمر بھر اُس کو خوشی
اک نمونہ بن گئی دنیا میں اُس کی زندگی
دل لگایا جس نے محنت سے کبھی ہارا نہیں
گردش حالات نے اُس کو کبھی مارا نہیں
جس نے کی محنت اُسے رتبہ بہت اونچا ملا
میں نے دیکھا عمر بھر اُس شخص کو ہنستا ہوا
جو سمجھتے ہیں کہ محنت کر کے کچھ حاصل نہیں
اصل میں وہ لوگ محنت کے ذرا قائل نہیں
جی چرایا جس نے محنت سے وہ پچھتایا بہت
یاد اس کو اپنا ماضی عمر بھر آیا بہت
اس سے تم بچ کے رہو ہے کاہلی سے جس کو پیار
مت کرو تم خود کو ایسے بدنصیبوں میں شمار
رائگاں جاتی نہیں محنت یہ سچ ہے دوستو
کامیابی کے لئے دن رات تم محنت کرو

خوشی کی تلاش

مس فرحین

اسکول کی چھٹی ہوتے ہی پنکی اپنا بھاری بیگ اٹھائے اسکول کے چھوٹے سے باغ میں آگئی۔ اسکول کا یہ چھوٹا سا باغ اسے بے حد پسند تھا اس لئے کہ اس میں گلاب کے رنگ برنگے بے شمار پھول ہر وقت کھلتے رہتے تھے جو اسے بہت پیارے لگتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر اس چھوٹے سے باغ میں اسکی پیاری دادی جان کی طرح ایک لمبا سا بوڑھا درخت بھی موجود ہے جس کی شکل ہو بہو دادی جان سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے چہرے کی جھریاں اور دادی جان کے چہرے کی جھریاں، اس کی لمبی لمبی زمین سے لگی ہوئی شاخیں اور دادی کے نرم گرم محبت سے بھرے بازو، اس کا جھکا ہوا تنا اور دادی جان کی جھکی ہوئی کمر، اور ان تمام باتوں کے باوجود وہ درخت ہمیشہ تر و تازہ نظر آتا بالکل پیاری دادی جان کی طرح۔ پھر بھلا یہ بوڑھا درخت پنکی کو کیوں نہ دادی جان لگتا۔ وہ تقریباً روز ہی اس بوڑھے درخت سے لپٹ کر

اسے پیار کرتی چومتی اور اسے اپنے ننھے ننھے بازوں میں سمیٹنے کی کوشش کرتی تو اسے یوں لگتا جیسے وہ اپنی دادی جان کی نرم گرم گود میں ہو۔

آج بھی پنکی حسب معمول اس بوڑھے درخت سے لگی اپنی وین کا انتظار کر رہی تھی کہ چند لمحوں میں ہی وین کی مخصوص آواز سنائی دی۔ پنکی نے جلدی سے بوڑھے درخت کو پیار کیا اور اپنا بھاری بیگ اٹھا کر تیزی سے گیٹ کی طرف دوڑ لگادی تاکہ اس کی سیٹ پر کسی کا قبضہ نہ ہو جائے۔ دراصل پنکی کو کھڑکی کے پاس بیٹھنے میں بے حد لطف آتا تھا سارا راستہ وہ ہر طرح کے لوگوں کو دیکھتے ہوئے آتی جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آئے۔ چنانچہ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہی پنکی نے اپنا بھاری بیگ اپنی گود میں رکھا اور کھڑکی کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ وین کے چلتے ہی اس کے خیالوں کا سلسلہ چل پڑا۔ سارے لوگ خوش ہیں، سب کے چہرے پر خوشیاں ہیں۔ سب کے پاس کوئی نہ کوئی خوشی ضرور موجود ہے بس میرے ہی پاس کوئی خوشی نہیں۔ اس نے سڑک سے باہر لوگوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

بس! وہی صبح اسکول جانا ہوم ورک کرنا، ٹی وی دیکھنا کھانا کھانا اور پھر سو جانا۔ بھلا اس میں کوئی خوشی والی بات ہے پورے دن میں میرے لئے ایک خوشی بھی نہیں۔ پنکی نے اپنے دن بھر کی مصروفیات پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔

ابھی اسکے خیالوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اس کا گھر آگیا۔ اس نے وین سے اتر کر تمام لڑکیوں کو اللہ حافظ کہا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوتے اپنے بنگلہ نما گھر میں داخل ہو گئی۔ حسب معمول پورے گھر میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

پنکی نے لان میں قدم رکھتے ہوئے سوچا۔

"آج دادی جان سے ضرور پوچھوں گی کہ خوشی کہاں پر ملتی ہے۔ یا پھر دادی سے کہوں گی کہ وہ اپنی خوشیوں میں تھوڑی سی خوشی مجھے دے دیں۔ ہاں! وہ مجھے ضرور دے دیں گی ان کے پاس تو بہت ڈھیر ساری خوشیاں ہیں۔ مگر دادی جان..... دادی جان تو اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں اور اللہ میاں کا گھر تو بہت دور ہے اتنا دور کہ میں وہاں جا ہی نہیں سکتی۔ پھر میں کیا کروں؟" پنکی نے اداس ہوتے ہوئے سوچا اور اس لمحے اس کا جی چاہا کہ لان میں وہی بوڑھا درخت اگ آئے اور وہ اس سے لپٹ کر خوب روئے "مگر یہاں نہ ہی پیاری دادی جان ہیں اور نہ وہ بوڑھا درخت۔" پنکی نے اپنے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے سوچا۔

چند لمحے گھاس پر بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ گئی اور اپنے کمرے میں آکر خاموشی سے لیٹ گئی۔

"ممی کہتی ہیں جسکے پاس تمام آسائشیں ہوں وہ خوش رہتا ہے مگر میں تو خوش نہیں۔" اس نے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔" اگر آج دادی جان یہاں ہوتیں تو ضرور میری مدد کرتیں۔ پیاری دادی آپ اللہ میاں سے اجازت لے کر تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس آجائیں۔" اس نے کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اچانک اسے یوں لگا کہ دادی جان کی نرم گرم محبت سے بھری ہوئی انگلیاں اس کے بالوں میں حرکت کر رہی ہیں۔

"دادی جان آپ!" پنکی نے دادی جان کے محبت بھرے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرے بچے تو نے مجھے یاد کیا اور میں نہ آتی؟" دادی جان نے سینکڑوں مرتبہ چوما ہوا پنکی کا منہ ایک مرتبہ پھر محبت سے چوم لیا۔

"دادی اماں کیا آپ میرے ساتھ خوشی کی تلاش میں میری مدد کریں گی؟" پنکی نے اپنے ننھے منے ہاتھوں کو دادی جان کی ہاتھوں میں دیتے ہوئے پوچھا۔

"مگر پیاری بٹی خوشیاں تو تیرے ارد گرد بکھری پڑی ہیں پھر بھلا اسے تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" دادی جان نے پنکی کے بالوں میں شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کہاں دادی جان میں نے ہر جگہ دیکھ لی مگر مجھے تو کہیں نظر نہیں آئی ہاں البتہ ممی کہتی ہیں جس کے پاس تمام آسائشیں موجود ہوں وہ خوش رہتا ہے میرے پاس تو تمام آسائشیں ہیں مگر میں تو خوش نہیں۔" پنکی نے دادی جان کی گود میں گھستے ہوئے کہا۔

"ہاں بٹی خوشیاں آسائشوں میں نہیں اللہ اور اس کے بندوں میں تلاش کی جاتی ہیں۔" دادی جان نے پنکی کو اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے دادی جان؟" پنکی نے فوراً ہی سوال کیا۔

"دیکھو بٹی اللہ سے ملاقات کرنا اس دنیا کی سب سے بڑی خوشی ہے اور یہ خوشی اللہ نے ہمیں خود فراہم کی ہے مگر ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔" دادی جان نے پیار بھری نظروں سے پنکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر دادی جان اللہ سے ملاقات بھلا کیسے کر سکتے ہیں وہ تو بہت ہی دور رہتے ہیں۔" پنکی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کے اشارے سے کہا۔

"نہیں میرے بچے، اللہ ہمارے ساتھ ہے اور ہر جگہ ہے اور پھر میری بٹی اللہ سے ملاقات ہم نماز

کے ذریعے کر سکتے ہیں نماز پڑھ کر دراصل ہم اللہ سے ملاقات ہی تو کرتے ہیں۔" دادی جان نے پنکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا اب میں سمجھی کہ آپ جب نماز پڑھتی ہیں تو اتنا خوش کیوں ہوتی ہیں آپ اللہ میاں سے مل کر جو آتی ہیں۔ ہے نا دادی جان!" پنکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں پنکی یہی بات ہے اللہ کی عبادت کر کے جو خوشی مجھے حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور کام میں نہیں اور جب مجھے ایک دن میں دنیا کی سب سے بڑی خوشی اتنی دفعہ مل رہی ہو تو پھر میں کیوں نہ خوش ہوں۔ اب تم بھی پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھنا۔ اس کے علاوہ اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالو چاہے کیسے ہی ہو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں بڑی راحت حاصل ہوتی ہے۔ اور پھر تمہارے پاس اتنی ساری آسائشیں اور وسائل ہیں تم ان سے اپنے ارد گرد بکھرے لوگوں کی مدد کرو اور ان کی دعائیں لو۔ ان کی دعاؤں سے تمہیں جو خوشی حاصل ہوگی وہ تم سنبھال نہیں پاؤ گی۔" دادی جان نے پنکی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دادی جان میری پیاری دادی جان آپ کتنی اچھی ہیں آپ نے مجھے اتنی ساری خوشیوں کا راستہ بتا دیا۔" پنکی نے دادی کی گود میں گھستے ہوئے کہا۔ "میں آج ہی سے اس پر عمل کروں گی۔" پنکی ابھی دادی جان سے وعدہ ہی کر رہی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گی اور وہ جلدی سے اٹھ گئی کیوں کہ عصر کی اذان کی آواز پاکیزہ خوشبو کی طرح اس کے پورے وجود میں پھیل رہی تھی "دنیا کی سب سے بڑی خوشی کا وقت، اللہ سے ملاقات کا وقت آگیا" پنکی نے بستر سے اٹھتے ہوئے سوچا۔ اور پھر اس دن کے بعد سے پنکی ہمیشہ خوش بلکہ بہت خوش نظر آتی ہے۔ اس کے ارد گرد خوشیوں کے اتنے پھول مہکنے لگے ہیں کہ وہ جس راستے سے جاتی ہے اسے مہکا دیتی ہے۔ اب پنکی نے اچھی طرح جان لیا ہے کہ خوشیاں دولت، آسائش اور امارت میں نہیں بلکہ اللہ اور اسکے بندوں میں تلاش کی جاتی ہیں۔ اور اللہ اور اسکے بندوں سے محبت کر کے ہم جو خوشیاں حاصل کرتے ہیں وہ لازوال ہوتی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتیں بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہیں۔

کھال

مرسلہ۔ اعجاز علی شیخ.....

"دیکھئے یہ کوٹ ریچھ کی کھال کا ہے۔ قیمت صرف پانچ ہزار روپے ہے۔" "اُف آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اپنی کھال اتروا کر ریچھ کی کھال پہن لوں۔"

ڈنڈا ڈولی

محمد شریف قریشی گھونکی

ایک صاحب نے اپنے دفتر کے نئے افسر کو دعوت دی۔ افسر کی ناک خاصی لمبی تھی۔ میزبان نے اپنے پانچ سالہ بچے کو جو بہت شریر تھا ڈانٹا کہ خبردار تم اس کی ناک دیکھ کر ہنسو گے نہیں۔ اور نہ ان کے سامنے اپنی ناک کھجاؤ گے۔

شام کو افسر موصوف گھر آئے تو بچے نے بڑے ادب سے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔ اس پر دونوں میاں بیوی نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کی بیوی چائے کے برتن اپنی طرف کھسکاتے ہوئے سوچنے لگی۔ ہماری ناک کٹتے کٹتے رہ گئی اور چائے بناتے ہوئے اس نے افسر سے پوچھا۔

آپ کی ناک میں کتنے چمچے چینی ڈالوں۔

میاں بیوی میں جھگڑا ہو رہا تھا کہ کون زیادہ قابل ہے

شوہر:۔ زیادہ باتیں مت کرو میں ایف اے ہوں

بیوی:۔ غصے سے بولی "وہ کیسے؟"

شوہر:۔ "یعنی فادر آف عدنان

بیوی:۔ (ایک دم بولی) تو میں ایم اے ہوں۔

یعنی مدر آف عدنان۔

صولت رعنا۔ راولپنڈی۔

ایک واقف کار کو ایک موٹے شخص نے بتایا "کل اتفاقاً میں آپ کے دوست پر گر پڑا تھا"

"آج اتفاقاً میں اسی کی تعزیت کو جارہا ہوں۔" واقف کار نے جواب دیا۔

عبدالحفیظ شہزاد ...... چک شفیع

ایک صاحب کانٹے میں کیچوا لگا کر مچھلیاں پکڑ رہے تھے لیکن مچھلیاں پھنسنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ اب ان صاحب نے روٹی کا ٹکڑا لگایا پھر بھی کوئی مچھلی نہ ہاتھ آئی پھر انہوں نے گوشت کا ٹکڑا لگایا اور محو انتظار ہو گئے۔ شام ہو گئی لیکن کوئی مچھلی نہ پکڑی گئی آخری انہوں نے تنگ آکر ڈور لپیٹی اور چند سکے پانی میں پھینک کر مچھلیوں سے کہا "کم بختو! جو چیز تمہیں پسند ہو خود خرید کر کھالینا۔"

بدر منیزہ ...... کراچی۔

ساجد:۔ میں اور میری ماں دونوں غیب کا علم جانتے ہیں

اکرم:۔ وہ کیسے؟

ساجد:۔ اس طرح کہ جب بادل چھا جاتے ہیں تو میری ماں کہتی ہے کہ بارش ہو گی جب کہ میں کہتا ہوں کہ نہیں ہو گی اس طرح کبھی اس کی بات سچ ثابت ہوتی ہے اور کبھی میری۔

عابد محمود راجہ ...... کوٹلی آزاد کشمیر

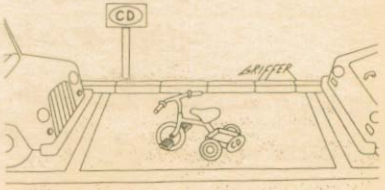

ایک دوست: (دوسرے سے) آپ کا چھوٹا بیٹا بہت بڑی گالیاں دیتا ہے۔

دوسرا دوست:۔ کوئی حرج نہیں بڑا ہو کر اچھی گالیاں دے گا۔

واصف اعجاز، پشاور

(ساجد راشد سے) آپریشن کرتے وقت ڈاکٹر چہرے پر سفید نقاب کیوں باندھ لیتے ہے۔

راشد۔ اس لئے کہ اگر مریض مر جائے تو اس کے رشتہ دار ڈاکٹر کو پہچان نہ سکیں۔

جاوید راجا ...... جھڈو

استاد ...... وہ کون سے تین لفظ ہیں جو اسکول میں طالب علم اکثر استعمال کرتے ہیں۔

شاگرد ...... میں نہیں جانتا۔

استاد ...... بالکل ٹھیک۔ شاباش۔

ہما رضوی، کوئٹہ۔

استاد ...... منفی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جنس یکساں ہو مثلاً ہم چار آدمیوں سے تین بینگن یا دس کتوں سے چھ آدمی نہیں نکال سکتے۔

شاگرد ...... لیکن جناب ہم دو بھینسوں میں سے چھ کلو دودھ تو نکال سکتے ہیں نا!

منزہ قیوم ...... جوہر آباد

ماسٹر ...... جزیرہ کی تعریف کرو۔

شاگرد ...... جزیرہ اسے کہتے ہیں جہاں سے بغیر کشتی کے اسکول نہ آسکیں!

یاسمین ناز، کراچی

پاکستان میں مختلف ذاتوں، نسلوں اور برادریوں کے لوگ رہتے ہیں۔ ہر برادری میں شادی کے رسم و رواج کچھ مختلف ہیں۔ مختلف ذات و نسل کے لوگ اپنے رسم و رواج کے ذریعہ سے اپنی ذات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ ڈاکٹر کی شادی کچھ اس طرح ہو کہ پتہ چلے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی شادی ہے۔

مثلاً ڈاکٹر کی شادی میں ابٹن کی جگہ "مرہم" استعمال کیا جائے اور مہندی کی جگہ "لال دوائی" لگائی جائے۔ صافے کی جگہ سر پر "پٹی" لپیٹی جائے۔ برات "ایمبولینس" میں جائے اور نکاح..... ہسپتال میں پڑھا جائے۔ تصویر کی جگہ "ایکسرے" لیئے جائیں۔

کھانے میں "وٹامن بی اور سی" کی گولیاں ہوں۔ بیرے ہاتھ میں "انجکشن" اور "گلوکوز" کی بوتلیں لے کر سروس کریں۔

تحفے بھی کچھ اس قسم کے ہوں کہ کسی نے "تھرمامیٹر" دیا تو کسی نے "ڈائی سیکشن" اور کسی نے "اسٹیتھس کوپ" جہیز بھی کچھ اس طرح کا ہو کہ باپ نے بیٹی کے نام ایک "کلینک" لکھ دیا جو لیبارٹری اور ایکسرے مشین وغیرہ سے آراستہ ہو۔

ایم اکرم سیال..... وکیل والا

ایک چور مکان میں داخل ہوا تو تجوری پر لکھا تھا۔ دائیں بٹن کو دبایئے۔ چور نے ایسا کیا تو سائرن بج اٹھا اور چور پکڑا گیا۔ عدالت میں جج نے پوچھا تم

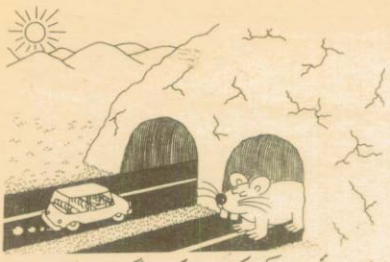

اپنی صفائی میں کچھ کہنا پسند کرو گے؟ چور نے بڑی اداس نظروں سے لوگوں کو دیکھا اور پھر افسردہ لہجے میں کہا۔" میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ دنیا بڑی دھوکے باز ہے۔"

نوید اختر، کراچی

استاد (شاگرد سے)..... "تم بار بار پیچھے دیکھ کر نقل کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔

شاگرد..... "جناب! میں نقل نہیں کر رہا یہ تو پرچے پر لکھا ہے کہ "پیچھے دیکھئے۔"

محمد اظفر علی..... کراچی

ایک شہری گاؤں میں پہنچا تو اس نے ایک کسان سے پوچھا۔ یہ جو سامنے گائے نظر آ رہی ہے۔ اس کے سینگ کیوں نہیں ہیں؟

کسان نے کہا..... سینگ نہ ہونے کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ بعض کے ہوتے ہی نہیں۔ بعض کے لڑنے بھڑنے سے ٹوٹ جاتے ہیں، اور بعض کے سینگ ہم خود کاٹ ڈالتے ہیں۔ باقی رہا سامنے والی گائے کے سینگ نہ ہونے کا سبب، تو وہ یہ ہے کہ وہ گائے نہیں گھوڑا ہے۔

محمد فیض اکرم بھٹی، لاہور

بیٹا: "امی" ابو کے سر پر بال کیوں نہیں ہیں؟"

امی: "بڑے لائق لوگ جو ہوتے ہیں وہ بہت بڑی بڑی باتیں سوچتے ہیں اس لئے ان کے سر سے بال اڑ جاتے ہیں۔"

بچہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔

"مگر امی آپ کے سر پر ڈھیر سارے بال کیوں ہیں؟"

"بکواس مت کرو" امی نے غصہ میں کہا۔

وقار علی ..... رسلپور

استاد! شاگرد سے توانائی کے کتنے ہیں

شاگرد ..... جناب جس توے پر نائی بیٹھا ہو اسے توانائی کہتے ہیں۔

خلیفہ اللہ بخش۔ تونسہ شریف

ایک روز لیک تاجر اپنے کارندوں کو کچھ اس طرح جھڑک رہا تھا۔ "تم لوگوں میں تو ذرا بھی خوفِ خدا باقی نہیں۔ غضب خدا کا اعلیٰ درجے کی اینٹوں کو چھوڑ کر تم گھٹیا اینٹیں ملاتے ہو مرچوں میں۔

محمد رضوان ..... اورنگی، کراچی

ایک نوجوان نے نہایت اداس لہجے میں اپنے دوست سے کہا "جبر اور زیادتی کی حد ہو گئی یار! میں اپنے چچا کو دفن کرنے والا تھا کہ پولیس نے آکر مجھے روک دیا اور جانتے ہو انہوں نے کیا کہا؟"

"کیا کہا؟" دوست نے حیرانی سے پوچھا۔

"انہوں نے کہا تم اپنے چچا کو دفن نہیں کر سکتے۔"

"لیکن وجہ؟" دوست نے پھر پوچھا

"وجہ یہ تھی کہ میرے چچا زندہ تھے!"

محمد زہیر ..... لاہور

محکمہ ڈاک کا ملازم جب تیس سال کے بعد ریٹائر ہوا تو الوداعی تقریب کے اختتام پر اس کے باس نے پوچھا۔ "ہاں! یہ تو بتاؤ کہ ہمارے ساتھ اتنے سال کام کر کے تم نے کیا تجربہ حاصل کیا؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "تجربہ تو بہت حاصل ہوا ہے جناب! بس آپ سے گزارش ہے کبھی میری پینشن کی رقم بہ ذریعہ ڈاک مت روانہ کیجئے گا۔"

قاسم اسحاق، کراچی

پہلا شکار

منیر احمد راشد

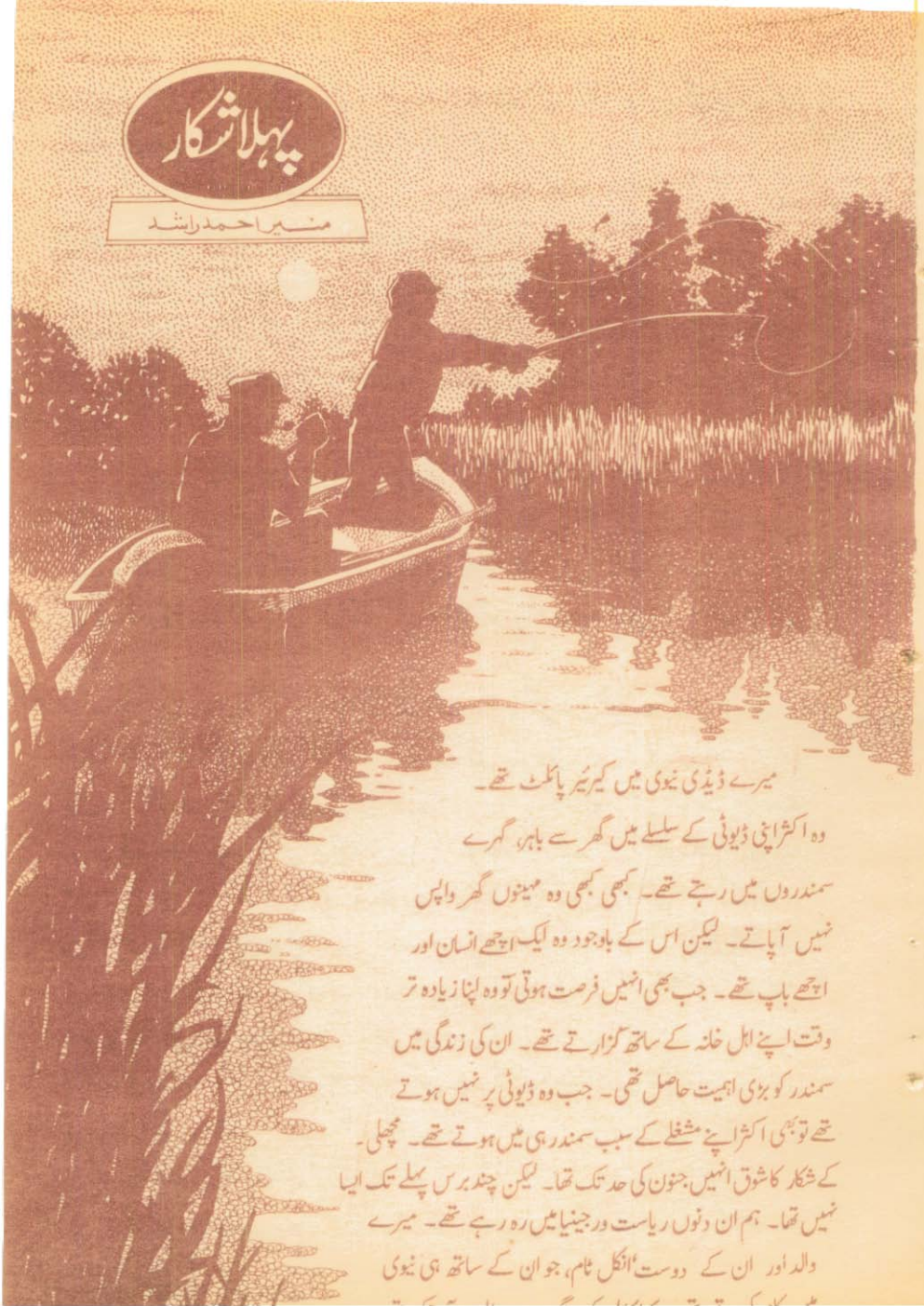

میرے ڈیڈی نیوی میں کیریئر پائلٹ تھے۔ وہ اکثر اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں گھر سے باہر، گہرے سمندروں میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مہینوں گھر واپس نہیں آپاتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک اچھے انسان اور اچھے باپ تھے۔ جب بھی انہیں فرصت ہوتی تو وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنے اہل خانہ کے ساتھ گزارتے تھے۔ ان کی زندگی میں سمندر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جب وہ ڈیوٹی پر نہیں ہوتے تھے تو بھی اکثر اپنے مشغلے کے سبب سمندر ہی میں ہوتے تھے۔ مچھلی کے شکار کا شوق انہیں جنون کی حد تک تھا۔ لیکن چند برس پہلے تک ایسا نہیں تھا۔ ہم ان دنوں ریاست ورجینیا میں رہ رہے تھے۔ میرے والد اور ان کے دوست 'انکل ٹام'، جو ان کے ساتھ ہی نیوی

اور آج کل انہیں فرصت ہی فرصت تھی۔ انکل ٹام بہت اچھے انسان تھے۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتے ، مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کا ایک مخصوص جملہ تھا،

"ہاں بھئی شریف آدمی کیا حال ہے؟" وہ پیار بھرے لہجے میں پوچھتے اور میں مسکرا کر اپنی خیریت سے انہیں مطلع کرتا۔ ان کا یہ انداز مجھے بہت پیارا لگتا تھا۔

انکل ٹام ہی وہ شخص تھے جنہوں نے میرے ڈیڈی کو مچھلی کے شکار کا عادی بنایا۔ وہ خود بھی اس کے بہت رسیا تھے۔ حالانکہ ڈیڈی کو شکار کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایک بہت اچھے شکاری بن چکے تھے۔ انکل ٹام نہ صرف ان کے دوست تھے بلکہ مچھلی کے شکار میں ان کے بہترین ساتھی بھی تھے۔

پھر یوں ہوا کہ انکل ٹام کی ڈیوٹی دوبارہ بحرالکاہل میں لگ گئی اور ایک دن ایک مشن کے دوران میں ان کا طیارہ دشمن کی زد میں آگیا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بحرالکاہل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ ان کی موت کا ہم لوگوں کو بہت دُکھ تھا۔ خاص طور پر ڈیڈی تو خود کو ادھورا ادھورا سا محسوس کرتے تھے۔ بہت دن تک تو وہ مچھلی کے شکار پر بھی نہیں گئے۔ ان کا خیال تھا کہ انکل ٹام کے بغیر شکار کا لطف ہی نہیں ہے۔

اس وقت میری عمر کوئی دس سال کے لگ بھگ ہوگئی۔ لیکن اس ننھی سی عمر میں بھی میں سمجھ سکتا تھا کہ ان کا تنہا مچھلی کے شکار پر جانا کتنا خطرناک ہے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں ان کا ونگ مین بن جاؤں۔ مگر مجھے خدشہ تھا کہ ڈیڈی میری اس تجویز کو مسترد کر دیں گے۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ ہر معاملے میں ان کا ایک معیار ہے۔ وہ کبھی بھی ایک اناڑی پارٹنر کے ساتھ شکار کھیلنے نہیں جاسکتے تھے۔ انہیں ایسے کھیل میں مزہ ہی نہیں آتا۔ وہ تو بھرپور مقابلے کے عادی تھے۔ ان کے پارٹنر تو انکل ٹام ہو سکتے تھے اور میں کسی طرح بھی انکل ٹام کی جگہ پُر نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے معلوم تھا کہ ڈیڈی کے نزدیک کسی ایسے کام کی کوئی اہمیت نہیں تھی جسے آپ مہارت کے بغیر شروع کریں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے، "یہ کیا کہ آدمی جب چاہئے منہ اٹھائے کوئی کام شروع کر دے۔ نہیں، پہلے اسے خوب مہارت حاصل کرنی چاہئے۔ ہر کام میں غلطی کا احتمال تو ہوتا ہی ہے۔ مگر کچھ غلطیاں ناقابل تلافی ہوتی ہیں اور اناڑی آدمی ہمیشہ ایسی ہی غلطیاں کرتا ہے۔" اور ڈیڈی کبھی ایسی غلطیوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن بعد کے تجربات نے سمجھایا کہ ڈیڈی ایسا کیوں کہتے تھے۔

مگر میرے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا۔ مجھے ہر حال میں اپنے ڈیڈی کا پارٹنر بننا تھا۔ میں

انہیں اداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اسی موسم بہار میں مَیں نے مچھلیاں پکڑنے کی مشق شروع کی۔ یہ ساری مشق گھر کے لان میں ہوتی تھی اور ڈیڈی مجھے اس ہنر کی مفید باتیں بتاتے جاتے۔ آخر کار ایک ماہ کی مشق سے میں اس قابل ہو گیا کہ ان کے ساتھ شکار پر جاسکوں۔

جس دن ہمیں شکار کے لئے جانا تھا اس سے ایک رات پہلے میں نے اپنا مچھلی پکڑنے کا سامان درست کیا۔ اسے خوب اچھی طرح چیک کیا اور بہترین حالت میں تیار کر کے رکھ دیا۔ گھڑی میں الارم لگایا اور اطمینان سے سونے کے لئے لیٹ گیا۔ لیکن اطمینان کہاں... میرا خیال ہے کہ وہ پہلی رات تھی جب میں اتنا چوکنّا ہو کر سویا تھا کہ الارم کی پہلی ہی آواز پر اٹھ بیٹھا۔ ایک عجیب طرح کا جوش مجھ پر طاری تھا۔ میں نے جلدی جلدی تیاری شروع کی اور جب ڈیڈی مجھے جگانے کے لئے میرے کمرے میں آئے تو میں نہا دھو کر لباس تبدیل کر کے بالکل تیار بیٹھا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور حیرت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات ان کے چہرے پر بکھر گئے۔ یہ دن کا ایک اچھا آغاز تھا۔

وہ صبح کاذب کا وقت تھا جب ہم شکار گاہ تک پہنچے۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ڈیڈی نے اپنی موٹر بوٹ کو ایک شہتیر سے باندھا اور ایک ہلکی سی ڈونگی میں منتقل ہو گئے۔ جو ہم پہلے ہی کرایہ پر حاصل کر چکے تھے۔ میں نے مچھلی پکڑنے کی ڈوری، راڈ، لنچ بکس اور دیگر ضروری سامان ان کے حوالے کیا جسے انہوں نے احتیاط سے کشتی میں رکھ لیا۔ پھر میں بھی اس چھوٹی کشتی میں کود گیا۔ ہم دونوں مل کر سامان کو چالو حالت میں لائے اور شکار کے لئے بالکل تیار ہو گئے۔ ہمارے عقب میں ایک پرانی گودی تھی جو قریب ہونے کی وجہ سے اس اندھیرے میں ایک سیاہ ہیولے کی طرح نظر آرہی تھی۔ باقی ہر طرف اندھیرا تھا۔

پھر مشرقی افق سے سورج نے ابھرنا شروع کیا۔ میں بڑے غور سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو ہلکی سی سفید لکیر قوس کی صورت میں افقی منظر پر نمودار ہوئی جو دھیرے دھیرے بہت واضح، صاف اور روشن ہوتی چلی گئی، پھر سورج نے سمندر کی کوہان کے پیچھے سے سر نکالا اور یوں کائنات کو دیکھنے لگا جیسے کوئی شخص اجنبی جگہ پر آکر حیرت سے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ وہ تھوڑا اور بلند ہوا..... تھوڑا اور..... اب ہر طرف اجالا پھیل چکا تھا۔ آسمان نے سیاہ چادر اتار دی تھی اور چاند ستارے بھی آرام کرنے جا چکے تھے۔ سورج ایک ہموار گول تھالی کی طرح آسمان کے کنارے پر اٹکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رنگ کچھ ایسا تھا جیسا انگارے کا ہوتا ہے۔ سیاہ سمندر نے بھی اپنا حلیہ تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا اور اب ہمارے چاروں طرف ساحلی جزیروں اور کھاڑیوں کا جال سا پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کائنات

نے ابھی ابھی جنم لیا ہو۔ منظر صبح اتنا حسین ہوتا ہے۔ اس کا مجھے پہلے اندازہ نہیں تھا۔ ایک عجیب لطیف سا سرور میرے دل و دماغ پر طاری تھا اور میں منظر کی دلکشی میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ جب ڈیڈی نے شکار کے لئے مجھے متوجہ کیا تو چونک سا گیا۔

طے یہ ہوا تھا کہ دونوں باری باری ایک ایک گھنٹے کے لئے شکار کھیلیں گے۔ جب ایک فرد شکار کرنے میں مصروف ہو گا تو دوسرا کشتی کو سنبھالے رہے گا تاکہ شکاری اطمینان اور پوری توجہ سے شکار کر سکے۔ پہلے میری باری تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ شکار کا سامان اٹھایا۔ اسے چیک کیا، کانٹے پر کیچوا لگایا اور ڈوری کو گھما کر سمندر کے اندر اچھال دیا۔

ہم اس وقت ایک جزیرے کے کنارے کے ساتھ ساتھ شکار کر رہے تھے۔ ڈیڈی نے اپنے تجربے اور مہارت کی وجہ سے ایک بہترین جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ یہاں سے ہم بہت سی مچھلیاں پکڑ سکتے تھے۔ میں حالانکہ گھر میں کافی پریکٹس کر چکا تھا۔ مگر اس وقت میری حالت بالکل اس بیٹسمین جیسی ہو رہی تھی جو نیٹ پریکٹس کے بعد پہلی مرتبہ کسی میچ میں بیٹنگ کر رہا ہو۔ ایک ہلکی سی کپکپی سارے وجود پر طاری تھی۔ ایک انجانا سا خوف...... ناکامی کا اندیشہ...... ایک نامعلوم سی بے اعتمادی...... اور جب یکسوئی نہ ہو، خود اعتمادی نہ ہو تو کوئی کامیابی کیسے ہو سکتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ایک مچھلی کانٹے میں لگی مگر کچھ میری حیرت کچھ عجلت اور کچھ ڈوری کے ڈھیلے پن کی وجہ سے چارہ کھا کر چلتی بنی اور میں منہ دیکھتا رہ گیا...... پہلی ناکامی یا یوں کہئے کہ ناکامی کا پہلا تجربہ بڑا تلخ ہوتا ہے۔ میں سخت شرمندہ تھا۔ جیسے مجھ سے بہت بڑی خطا ہو گئی ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یکدم مفلوج ہو کر رہ گئی۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آنے لگے۔ "ڈیڈی کیا کہیں گے، کہ لو چلے تھے انکل ٹام کی جگہ سنبھالنے اور پہلی ہی مچھلی نکل گئی۔ یہ بنیں گے میرے ونگ مین"...... مجھے معلوم تھا ڈیڈی غلطیوں کو برداشت نہیں کرتے۔ وہ ضرور مجھے ڈانٹیں گے۔ پھر جب گھر جا کر یہ بات ممی کو معلوم ہو گی تو ان کے سامنے میری کتنی سبکی ہو گی۔ انہیں خیالات کے ہجوم اور اپنی ناکامی کے احساس کی وجہ سے قریب تھا کہ میں رو پڑتا کہ میری سماعت سے ڈیڈی کی آواز ٹکرائی۔ وہ بڑے پیار بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے،

"توجہ سے بیٹا، توجہ سے...... زندگی میں ناقابلِ تلافی غلطیاں اسی وقت ہوتی ہیں جب انسان اپنے کام کی طرف بھرپور توجہ نہیں دیتا...... یکسوئی بڑی نعمت ہے...... یکسوئی سے کام کرو۔"

ڈیڈی کی بات سن کر میرے اندر ایک انقلاب سا آگیا اور پہلی ناکامی کی وجہ سے جو مایوسی کے بادل میرے ذہن پر چھاتے چلے جا رہے تھے، یکدم چھٹ گئے۔ ایک نئی روشنی سی دماغ میں بھر گئی، اعتماد

اور حوصلے کی روشنی...... میں نے مڑ کر ڈیڈی کی طرف دیکھا...... توانہوں نے مسکرا کر گردن سے اشارہ کیا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "کام جاری رکھو...... شاباش۔"

میں نے ایک نئے اعتماد کے ساتھ دوبارہ ڈوری ڈالی۔ مگر اس مرتبہ کوئی مچھلی نہیں لگی۔ جب ایک گھنٹہ پورا ہو گیا تو ڈیڈی نے اپنی ڈوری اور کانٹا سنبھالا اور مجھے کشتی سنبھالنے کے لئے کہا۔ اس وقت میں بڑے شوق اور جوش سے مچھلی پکڑنے کے موڈ میں تھا۔ مجھے یہ تبدیلی ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ لیکن یہ تو طے شدہ پروگرام تھا۔ اس لئے بادلِ نخواستہ مجھے چپو سنبھالنے پڑے۔

ڈیڈی نے بالکل ماہر شکاری کی طرح اپنے اوزار سیٹ کئے اور شکار میں مگن ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک بڑی مچھلی ان کے کانٹے میں لگی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ہک کو سیٹ کرتے، وہ مچھلی تڑپ کر کانٹے سے نکلی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہوئی تھی کہ میں کشتی کو بالکل ساکن نہیں رکھ سکا تھا۔ میری توجہ بھی پیڈل سے زیادہ مچھلی کی طرف ہو گئی تھی۔ جونہی مچھلی نکلی ڈیڈی نے ایک اور اضطراری کوشش کی...... مگر بے فائدہ...... اپنی اس غلطی پر بھی میں خاصا نادم ہوا تھا۔ ڈیڈی نے صرف میری طرف دیکھا...... کچھ بولے نہیں...... اور ان کا یہ دیکھنا ہی میرے لئے کافی تھا۔ اس لئے اگلے پندرہ منٹ میں نے اپنی پوری توجہ پیڈلوں پر مرکوز کر دی۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے بیس بال کے کوچ نے ہمیں سکھایا تھا کہ بیٹ پر توجہ کس طرح مرکوز کرتے ہیں۔ لیکن اس عرصے میں کوئی بھی مچھلی کانٹے میں نہیں لگی۔ گھنٹہ پورا ہو چکا تھا۔ اب حالانکہ میری شکار کی باری تھی لیکن میں نے سوچا میری عدم توجہ کی وجہ سے ڈیڈی اپنے شکار میں ناکام رہے ہیں اس لئے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں شکار کے لئے مزید وقت دیا جائے۔ مگر ڈیڈی ایک فوجی آدمی تھے۔ اصولوں کے سختی سے پابند۔ میرے لاکھ اصرار کے باوجود انہوں نے مزید وقت لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سارے کام طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوں گے۔

میں نے چپو ڈیڈی کے حوالے کئے اور ایک بھرپور اعتماد کے ساتھ شکار کا آغاز کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈیڈی نے کشتی کو نہ صرف بالکل ساکن رکھا ہوا ہے بلکہ مجھے شکار کے لئے بہترین زاویہ بھی فراہم کیا ہے۔ میں نے سوچا اپنی باری پر میں بھی انہیں ایسی ہی سہولتیں مہیا کروں گا اور کوئی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ میں بڑی محنت، توجہ اور شوق سے شکار میں مگن تھا کیونکہ ڈیڈی نے نصیحت کی تھی کہ ہر کام پورے اعتماد سے کرنا چاہئے۔ اکثر جلد بازی بنے بنائے کام کو بگاڑ دیتی ہے اور خصوصاً مچھلی کے شکار میں تو جلد بازی ایک ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے ان کی یہ نصیحت پلے سے باندھ لی تھی۔ اسی لئے جیسے ہی مجھے ڈوری میں حرکت محسوس ہوئی میری تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔ میں نے

ڈیڈی سے اس کھیل کے جتنے داؤ پیچ سیکھے تھے سب ذہن میں تازہ ہوگئے اور میں نے کسی ماہر شکاری کی طرح ہک کو درست کیا اور مچھلی میرے کانٹے میں پھنس گئی۔ میں بہت خوش تھا۔ مچھلی کو کانٹے سے الگ کر کے کشتی میں ڈالا گیا۔ یہ کوئی دو پاؤنڈ کے قریب وزنی ہوگی۔ مچھلی سامنے پڑی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اسے میں نے ہی شکار کیا ہے۔ ڈیڈی نے مچھلی کو تھیلے میں ڈالا اور مجھے مبارکباد دی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اس کارنامے پر مجھ سے زیادہ ان کو خوشی اور فخر ہو رہا ہو۔

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میری اس کامیابی میں ڈیڈی کے کشتی کو ساکن رکھنے اور شکار کے نقطہ نظر سے مجھے ایک بہترین زاویہ مہیا کرنے کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ورنہ ایک ڈولتی ہوئی کشتی میں، جس میں کہ انسان اپنا توازن بھی برقرار نہ رکھ سکتا ہو، بھلا شکار کیسے کر سکتا ہے۔ اپنی باری پر میں نے یہ تمام سہولتیں اپنی تمام تر کوششوں سے ڈیڈی کو بھی مہیا کیں مگر وہ کوئی مچھلی پکڑنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ لنچ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر ہم دونوں میں سے کسی کو بھی کامیابی نہ ہوئی۔ لنچ کے دوران ڈیڈی نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"بہت عمدہ جارہے ہو بھئی۔"

"مگر آپ ابھی تک مچھلی نہیں پکڑ سکے ڈیڈی۔"

"ہاں! ایسا ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو سارا دن ایک بھی مچھلی نہیں لگتی۔ جب تم چند سال تک باقاعدہ شکار کھیلتے رہو گے تو تم کو بھی ایسے تجربات ہوں گے۔" ڈیڈی نے جواب دیا۔ ان کے لہجے میں کہیں بھی مایوسی یا ناکامی کے احساس کی جھلک نہیں تھی۔ میں ابھی تک ان کی اس پہلی کوشش کو نہیں بھولا تھا جو میری وجہ سے ناکام ہوگئی تھی..... کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"ڈیڈی وہ پہلی مچھلی جو آپ کے کانٹے سے نکل گئی تھی کتنی بڑی ہوگی؟"

"یہ بتانا تو مشکل ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک چھوٹی سی مچھلی خاصی جدوجہد کرتی ہے تو احساس ہوتا کہ کوئی بڑا مال پھنسا ہے اور بعض اوقات ایک بڑی مچھلی بھی بغیر شدید مزاحمت کے چلی آتی ہے۔"

"مگر میں نہیں مانتا کہ وہ کوئی چھوٹی مچھلی تھی۔ ڈوری کے تناؤ سے لگتا تھا کہ کوئی بڑا مال ہے۔" میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔" ڈیڈی نے زیادہ بحث نہیں کی۔

"کیا تم تھک گئے ہو؟"

"نہیں تو ڈیڈی..... میں تو ابھی اور شکار کھیلوں گا۔"

دراصل تمام تر گفتگو اور ڈیڈی کی تسلی بخش باتوں کے باوجود میں چاہتا کہ آج کا دن شکار کے حوالے سے ان کے لئے کامیاب ترین دن ہو اور اگر وہ مجھے اجازت دیتے تو میں شام تک صرف چپو چلانے اور کشتی کو سنبھالے رکھنے کے لئے تیار تھا تاکہ وہ اطمینان اور انہماک سے شکار کرتے۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک اصول پرست انسان ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم مقرر کردہ شیڈول کے مطابق شکار کرتے رہے۔

شام ہو چلی تھی۔ سورج مغرب میں جزیرے کے پیچھے غائب ہونے کے لئے تیزی سے لپک رہا تھا۔ چپو چلاتے چلاتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ چکے تھے اور ریڑھ کی ہڈی میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔ سارا جوش اور جذبہ ماند پڑتا جا رہا تھا۔ تب ڈیڈی نے کہا "ہم ایک اور جگہ چلتے ہیں۔ جہاں مجھے یقین ہے کہ ہم بہتر شکار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" جزیرے کے ویران ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم ایک ایسے جگہ آ گئے جو چٹانوں کے اندر ذرا دور تک تنگ سی ندی کی صورت میں چلی گئی تھی۔ یہاں پانی ذرا گدلا سا تھا۔ پانچ چھ فٹ سے زیادہ نظر کام نہیں کرتی تھی۔ ڈیڈی جیسے جیسے مجھے ہدایت دیتے جا رہے تھے میں کشتی کو بالکل ان کے احکام کے مطابق بہتر سے بہتر پوزیشن میں رکھ رہا تھا۔ وہ اپنا کانٹا چارا لگا کر پانی میں پھینک چکے تھے۔ ڈوری کوئی تیس فٹ تک گہرے پانی کی نشان دہی کر رہی تھی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ڈوری میں حرکت ہوئی ڈیڈی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ہدایت دی کہ مال بڑا ہے۔ اس لئے کشتی تیار رکھی جائے تاکہ اس کو تھکا کر گرفتار کیا جا سکے۔ میں بالکل چاک و چوبند ہو گیا۔ ڈوری میں ذرا تناؤ پیدا ہوا اور پھر مچھلی خطرہ محسوس کرتے ہی پناہ گاہ کی طرف ڈوری۔ ڈیڈی چلائے "کشتی کو اس کے تعاقب میں دوڑاؤ۔" وہ ایسے ہی بات کر رہے تھے جیسا کہ میرا خیال ہے وہ اپنے ونگ مین سے کرتے ہوں گے۔

میں بالکل کسی روبوٹ کی طرح اس حکم کی تعمیل میں لگ گیا اور پورے زور سے چپو چلانے لگا۔ تھوڑی دیر یہ آنکھ مچولی جاری رہی پھر ڈیڈی نے ڈوری کھینچنا شروع کر دی۔ ایک بڑی مچھلی کانٹے سے لٹک رہی تھی۔ ڈیڈی بہت خوش تھے۔ لیکن شاید میں ان سے زیادہ خوش تھا۔

ہم نے مچھلی کو تھیلے میں ڈالا اور گھر کی جانب چلے۔ گھر پہنچ کر جب میں مچھلی صاف کر رہا تھا تو فتح کا ایک عجیب نشہ آور سا احساس مجھ پر طاری تھا۔ دن بھر کی تھکن سے جسم میں جو ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا وہ بھی مزا دے رہا تھا۔ ڈیڈی بار بار میرے پیٹھ ٹھونکتے اور شاباش دیتے تو دل بہت خوش ہوتا۔ انہوں نے ممی کو بتایا کہ یہ ساری کامیابی میری ہی وجہ سے ہوئی ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ڈیڈی نے میرے کندھے

اور بازو دبائے، میرے زخمی ہاتھوں پر مرہم لگایا اور مجھے سو جانے کی ہدایت کی۔ میں تھکا ہوا تو تھا ہی فوراً اپنے بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔ جب میں بستر پر لیٹا نیند کی وادی کی طرف سفر کر رہا تھا تو میں نے سنا کہ ڈیڈی، ممی کو بتا رہے تھے۔

"مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے۔ آج کی کامیابی کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ مجھے ایک نیا ساتھی مل گیا ہے۔ یوں سمجھو ٹام زندہ ہو گیا ہے۔"

وہ کافی بلند آواز میں بات کر رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ میں سن لوں اور میں نے ان کی بات سن لی تھی۔ انکل ٹام کی جگہ سنبھالنے کی میری خواہش پوری ہو گئی تھی۔ کامیابی کے ایک بھرپور احساس کے ساتھ میں نیند کی آغوش میں ڈوبتا چلا گیا۔

(ماخوذ)

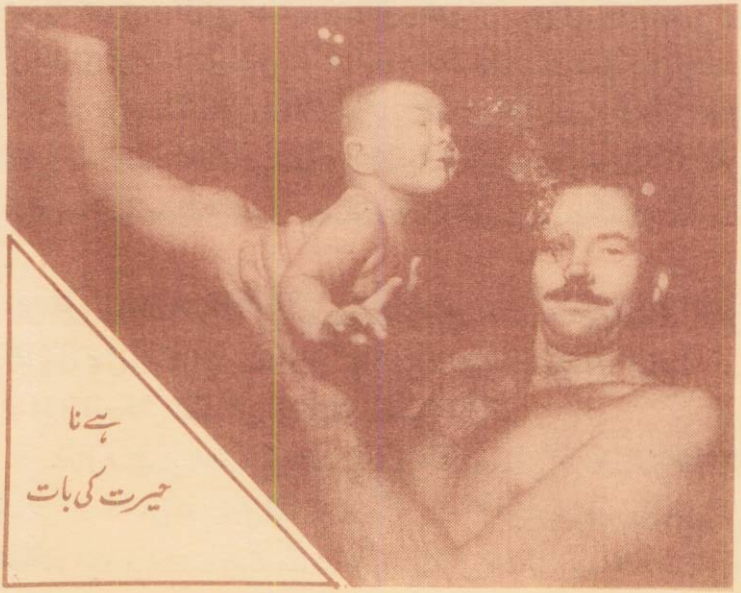

شیر خوار بچہ اپنے ابو کے ساتھ گہرے پانیوں میں

دُودھ پلانے والے سمندری جانور

شین فاروقی

دودھ پلانے والے بہت سے حیوانات زمین کے بجائے سمندر میں رہتے ہیں۔ ان حیوانات کے پاؤں کی جگہ پر ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر پانی کے اندر سانس نہیں لے سکتے چنانچہ یہ حیوانات پانی سے باہر ایک گہرا سانس لے کر پانی کے اندر ڈبکی لگاتے ہیں۔ یہ پانی کے اندر بہت نیچے تک جا سکتے ہیں۔ اسپرم نام کی وہیل پانی کے اندر ایک ہزار میٹر تک جا سکتی ہے اور یہ اتنی گہرائی میں ایک گھنٹے سے زیادہ تک رہ سکتی ہے۔ جب یہ وہیل پانی کی سطح پر آتی ہے تو یہ اپنے پھیپھڑوں میں موجود استعمال شدہ ہوا کو باہر نکالتی ہے جس کے باعث پانی کا ایک فوارہ سا چھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

دودھ پلانے والے سمندری حیوانات کی تین اقسام ہیں۔

(۱) سیل

(۲) سی لائن یعنی پانی کا شیر

(۳) اور والرس

یہ تمام حیوانات بچے پیدا کرنے کے لئے سمندر کے کناروں پر گروہ کی شکل میں قیام کرتے ہیں۔ یہ حیوانات خشکی پر رینگتے ہیں لیکن پانی کے اندر

زیبرے افریقہ میں پائے جاتے ہیں، ان کے جسم پر موجود دھاریوں کے باعث ان کے دشمن کے لیے انہیں فاصلے سے پہچاننا مشکل ہوتا ہے

دو رنگوں کا سندر سندر
یہ ہے ایک افریقی بندر

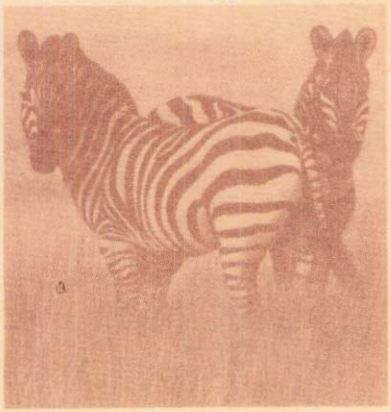

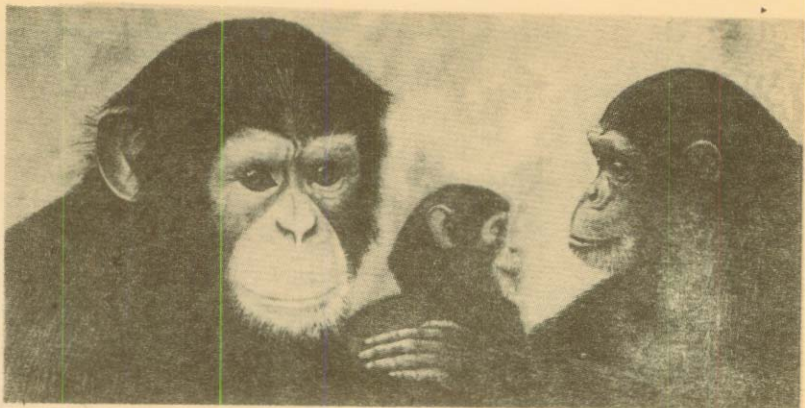

چمپینزی انسانوں سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں. یہ اپنی محبت اور غصّہ کے اظہار کے لیے نہ صرف یہ کہ مخصوص زبان استعمال کرتے ہیں بلکہ اشاروں کنایوں اور چہرے کے تاثرات کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں.

یہ بہت تیزی کے ساتھ تیرتے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق پانی کے اندر ان کی رفتار چالیس کلو میٹر فی گھنٹہ تک ہوتی ہے۔ یہ حیوانات چھوٹی مچھلیوں اور پانی کے دیگر چھوٹے حیوانات کو غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ البتہ چیتا وہیل پینگوئن کا شکار کرتی ہیں۔ ان حیوانات میں کچھ ایسے حیوانات بھی پائے جاتے ہیں جو سمندر میں موجود پودوں کو غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایسے حیوانات کو اسی باعث سمندری گایوں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ سمندری گائیں اپنے بچوں کی پیدائش کے لئے کناروں پر نہیں آتیں بلکہ یہ سمندر میں ہی یہ کام انجام دیتی ہیں۔

ڈولفن سمندری حیوانات کا ایک اور منفرد گروہ ہے۔ یہ سمندر کے دیگر حیوانات سے کہیں زیادہ مچھلیوں کے ساتھ مشابہت ......رکھتی ہیں۔ یہ پانی کے اندر ہی اپنی نسل کی پرورش کرتی ہیں۔

سمندری حیوانات میں ڈولفن سب سے زیادہ ذہین سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ آوازوں کی زبان میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان کے دانت ہوتے ہیں جن کی مدد سے یہ اپنے شکار کو پکڑتی ہیں۔ ڈولفن کی ایک قسم جو "قاتل وہیل" کہلاتی ہے سمندری کچھوؤں، سمندری شیروں اور وہیل پر حملہ کرتی ہے۔ وہیل مچھلی کی کئی اقسام ایسی ہیں جن کے دانت نہیں ہوتے۔ سمندر کے سب سے بڑے حیوان یعنی بلو وہیل کے دانت نہیں ہوتے۔ دانتوں کی جگہ ان کے منہ میں کنگھوں کی طرح کی پلیٹیں ہوتی ہیں جن کی مدد سے یہ چھوٹے جسم کے حیوانات کو گرفت میں لاتی ہیں۔ ان کا وزن ۱۶۶ ٹن تک ہوتا ہے۔ ان کے وزن سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک دن میں کتنی غذا استعمال کرتی ہوں گی۔

دودھ پلانے والے حیوانات کی کئی اقسام پیڑ

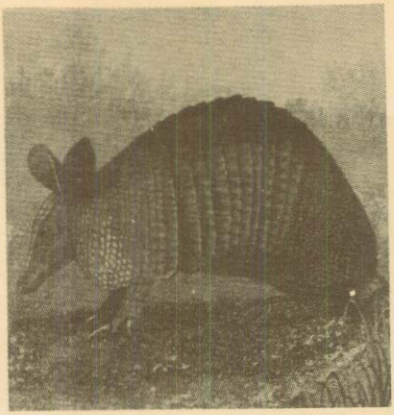

آرماڈیلو نام کا یہ جانور خطرے سے بچنے کے لیے گیند کی طرح لڑھکتے ہوئے بھاگتا ہے۔

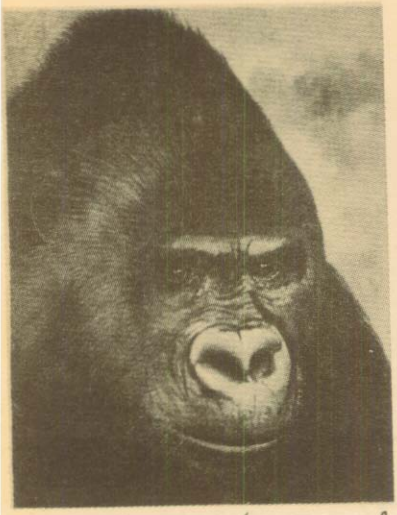

گوریلے بھی خاندان بنا کر رہتے ہیں۔ یہ افریقہ میں بڑے پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔

پودوں، کیڑے مکوڑوں (جیسے کیچوا) کو غذا کے طور پر کام میں لاتی ہیں۔ ایسے بہت سے بڑے حجم کا حیوانات گھاس اور پتیاں کھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر زیبرا، ہرن، زرافہ، دریائی گھوڑا، اونٹ،

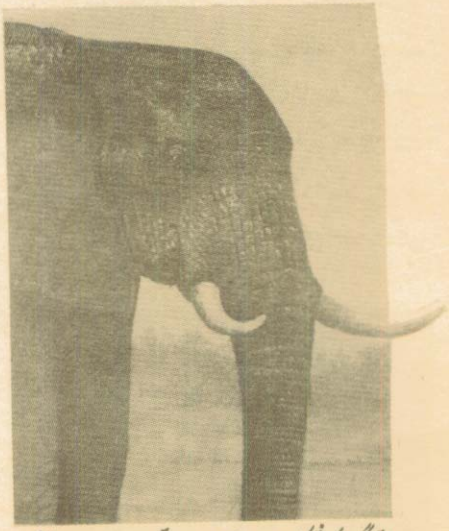

ہاتھی گروہ کی شکل میں رہتے ہیں۔ ہاتھی بھارت اور افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ افریقہ کے ہاتھی بھارتی ہاتھیوں سے بڑے

وغیرہ۔ اس طرح کے حیوانات میں ہاتھی سب سے بڑے حجم کا ہوتا ہے۔ ہاتھی کی سونڈ دراصل اس کی ناک ہے۔ ہاتھی سونڈ میں پانی بھر کر منہ کے اندر ڈالتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ درختوں کی شاخوں کو توڑ کر نیچے گراتا ہے اور پھر انہیں کھاتا ہے۔

گھاس اور کیڑے مکوڑے کھانے والے بہت سے حیوانات چھوٹے قد و قامت کے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً خرگوش، گلہری، چوہے، اور جنوبی امریکہ میں پایا جانے والا Armadillo جس کے جسم پر ہڈیوں کا سخت خول ہوتا ہے۔ وغیرہ

زمین میں رہنے والے لاکھوں حیوانات میں سے صرف ۱۷۰ ایسے ہیں جو انسان کے ساتھ کسی نہ کسی اعتبار سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ حیوانات بندر کی نسل سے ہیں۔ انسان کے ساتھ ان کی

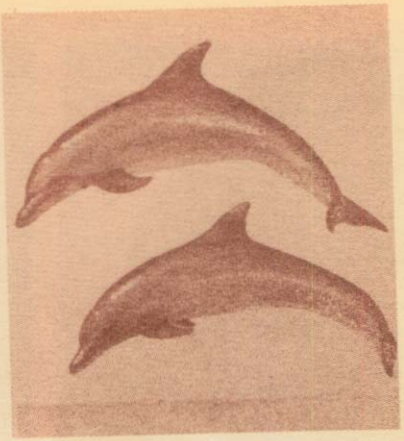

ڈولفن مچھلیاں جو گروہ کی شکل میں رہتی ہیں، تیرتی ہوئی اکثر پانی سے باہر آجاتی ہیں۔

سیل مچھلیاں اپنے بچوں کی پیدائش اور پرورش کے لیے ساحلوں پر قیام کرتی ہیں۔

مشابہت صرف اتنی ہے کہ انسانوں کی طرح ان کے چہرے کے سامنے دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ ان کے منہ، کان اور ناکیں بھی انسانوں سے ملتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں جن پر ناخن ہوتے ہیں۔ ان ہاتھوں کو وہ اشیاء، کو پکڑنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کی مدد سے وہ پیڑوں کی ڈالیوں کو پکڑ کر جھولتے ہیں اور ادھر سے ادھر چھلانگ لگاتے ہیں۔ یہ انسانوں کی طرح آگے پیچھے کی جانب چل اور دوڑ سکتے ہیں۔

گوریلے اور چمپینزی جو کہ افریقہ میں پائے جاتے ہیں انسانوں سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔

گوریلوں کو عام طور پر ایک خطرناک حیوان سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس وہ بہت شریف حیوان ہیں۔ چمپینزی اور بندروں کی طرح یہ بھی خاندان بنا کر رہتے ہیں۔ بندر کی نسل میں سب سے زیادہ ذہین حیوان چمپینزی ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ چمپینزی اشاروں کی ایک خاص زبان میں ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ تاہم یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ حیوانات انسان کے ساتھ صرف جسمانی اعتبار سے مشابہت رکھتے ہیں ورنہ ہمارے عقیدے کے مطابق ان کا انسان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کیوں کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنا کر اسی صورت میں زمین پر بھیجا ہے۔

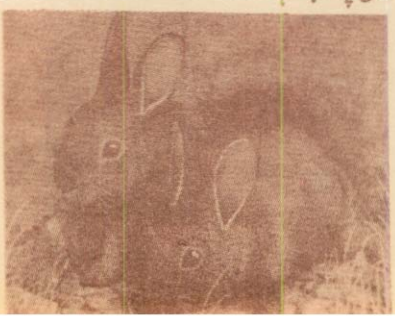

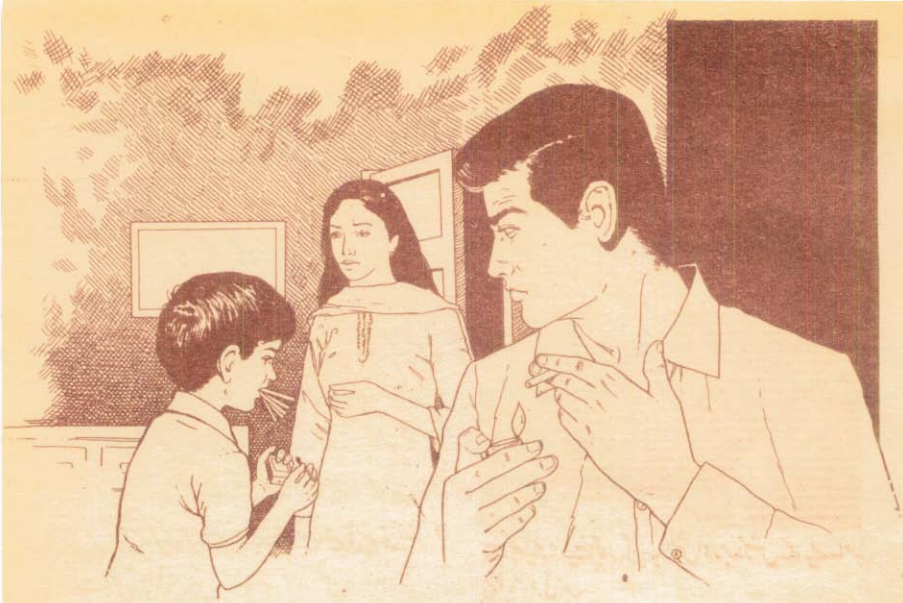

فیصلہ

عامر یوسف

شعیب جب کھانے کی میز پر پہنچا تو نو بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ "ارے بھئی بیگم..... کہاں ہے ناشتہ..... جلدی سے لے آؤ..... بھوک بھی لگ رہی ہے اور دیر بھی ہو رہی ہے....." شعیب نے میز پر پڑے اخبار کو اٹھاتے ہوئے اپنی بیوی کو کہا جو کہ باورچی خانے میں انڈا تلنے کے آخری مراحل میں تھیں۔

"پہلے اپنا اخبار تو پڑھ لیں..... ناشتہ چاہے چھوٹ جائے..... آپ کا یہ اخبار تو کبھی نہیں چھوٹتا" انہوں نے روٹی نکالتے ہوئے کہا۔ شعیب بھی اخبار دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔

ناشتے کی میز سے اٹھتے اٹھتے مزید پندرہ منٹ صرف ہو گئے۔

"اوہ..... ساڑھے نو..... میرے خدا..... دفتر کو لیٹ ہو رہا ہوں..... وہ گاڑی کی چابی کہاں ہے؟" شعیب نے اخبار ایک طرف چھوڑا اور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں ہوتی ہے..... وہیں ٹی وی پہ رکھی ہوئی ہو گی..... اور ہاں..... دفتر سے واپسی پر اسد کیلئے

کیک لانا نہ بھولیئے گا....."

شعیب نے یہ تمام ہدایات جوتا پہنتے ہوئے سنیں۔ جھٹ پٹ اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر کی طرف دوڑا۔

"اچھا بھئی اللہ حافظ....." شعیب نے گھر کا دروازہ کھولا..... قدم باہر نکالا اور پھر رک گیا۔

"کیوں کیا ہوا....."

"وہ پیکٹ تو اٹھا دو..... میں تو بھول ہی گیا تھا..... بستر کے کنارے ہو گا..... رات کو سونے سے پہلے وہیں رکھا تھا....." شعیب نے کہا اور اپنی بیوی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پیکٹ اس کی جیب میں تھا اور وہ خود گاڑی کے اندر۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا.....

شعیب تیس سال کا ایک کامیاب انسان تھا۔ اس نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی اور اب چھ سال کے عرصے سے ایک مقامی فرم میں ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی تنخواہ بھی بہت زور دار تھی اور زندگی میں بھی ہر طرح کی آسائش میسر تھی۔ اپنا ذاتی مکان بھی تھا اور ایک نہایت وفا شعار بیوی بھی۔ پھر ملازمت بھی ایسی تھی کہ زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑتی اور وہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ہی بیٹھا رہتا تھا۔ آنے جانے کی بھی کوئی مشکل نہیں تھی۔ اس کی ذاتی گاڑی بھی موجود تھی، اور فرم کی گاڑی بھی کسی وقت مل سکتی تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کی زندگی میں اس کی سب سے عزیز چیز اس کا بیٹا اسد بھی تو اس کے پاس تھا۔ اسد کی عمر پانچ برس سے زائد ہو چکی تھی۔ اور ہر وقت کی وہ معصومانہ شرارتیں تو شعیب کی زندگی میں گویا پھول سے کھلا دیتی تھیں اور اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر شعیب کو یوں محسوس ہوتا جیسے اللہ نے اس کو جنت میں پہنچا دیا ہو۔ غرض یہ کہ اس کی زندگی ہر طرح سے بھرپور اور مکمل تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے میز پر رکھے ہوئے نقشے اور فائلیں ایک طرف سرکائیں، ایش ٹرے سامنے رکھی اور جیب سے پیکٹ نکال لیا۔ اس میں سے ایک سگریٹ منتخب کی اور ہونٹوں میں لگالی۔ لائٹر سے اس نے سگریٹ سلگائی اور دھوئیں کا ایک زور دار کش کھینچ لیا۔ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ پینے لگا۔ چند منٹوں بعد اس کا اسسٹنٹ نئے ڈیزائن دکھانے اور ان کے متعلق ماہرانہ گفتگو کرنے کیلئے آ گیا۔ دونوں کئی گھنٹے تک نئے ڈیزائنوں پر بحث کرتے رہے۔ پھر چپراسی چائے لے آیا۔ شعیب نے چائے پی اور سگریٹ نکال کر سلگائی۔ یونہی دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ آج شعیب کو کھانا اپنے باس کے ساتھ کھانا تھا۔ ساتھ ہی اسے ان ڈیزائنوں کے متعلق بھی بتانا تھا۔ شعیب کا باس شعیب کی کارکردگی سے بہت خوش ہوا۔ شعیب نے خوش ہو کر باس کو سگریٹ پیش کی اور دونوں ہنستے ہوئے سگریٹ پینے لگے۔

"اوہ..... سر..... ایک نئی پارٹی کو آنا تھا..... میں آفس جاتا ہوں....." شعیب نے گھڑی دیکھتے

ہوئے کہا۔

"بالکل بالکل...... جاؤ۔" باس نے اجازت دے دی۔ اور شعیب اپنے آفس آ گیا۔ یہاں اس نے ایک نئی پارٹی سے اپنی فرم کا ایک معاہدہ کیا۔ پانچ بجے وہ دفتر سے اٹھ گیا۔ راستے میں اس نے اپنی کار ایک بیکری کے سامنے روک دی۔ اسد کیلئے ایک کیک بھی تو خریدنا تھا۔ کار سے اترتے ہوئے شعیب سگریٹ کا دھواں فضاء میں بکھیرتا اور کبھی خود سانسوں کے ساتھ اپنے اندر کھینچتا ہوا بیکری میں داخل ہو گیا۔ اس نے ایک کیک پسند کیا اور پیک کروا کے واپس گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

گھر میں اس کی بیوی اور اسد دونوں ہی انتظار کر رہے تھے۔ اسد تو دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور زور زور سے "ابو آ گئے......" چیخنے لگا۔ شعیب نے کیک تو بیگم کے حوالے کیا اور خود اسد کو ہاتھوں میں اٹھا کر ہوا میں اچھالنے لگا۔

شام کی چائے پر اسد تو کیک پر ٹوٹ پڑا اور شعیب نے پیکٹ سے آخری سگریٹ نکال کر سلگا لی۔ پھر ٹی وی کھول کر خبریں سننے بیٹھ گیا۔ خبروں کے بعد تینوں ٹہلنے کیلئے پارک چل دیئے۔ پارک میں وہ اور اسد خوب کھیلے۔ اسد تو گھاس پہ خوب ہی بھاگا۔ شعیب کو وہاں سے واپسی پہ یاد آیا کہ سگریٹ تو سب ختم ہو چکے ہیں۔ اس نے راستے میں سگریٹ کا نیا پیکٹ خریدا اور وہیں ایک سگریٹ سلگا لی۔ اسد بغور اپنے ابو کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ سب ڈرامہ دیکھ رہے تھے کہ شعیب کا کوئی دوست آ گیا۔ شعیب اپنے دوست کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ جب وہ دوست گیا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ شعیب اسد کے کمرے کی طرف گیا تاکہ دیکھ سکے کہ وہ سو گیا ہے یا نہیں مگر اسد تو اپنے کمرے میں تھا ہی نہیں۔ شعیب کو ٹی وی کی آواز سنائی دی۔ شاید اسد ابھی تک ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ شعیب ٹی وی والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ پھر اس کا خون رگوں میں منجمد ہو گیا۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا ...... سانس رک گئی اور آنکھیں خوف اور شدید حیرت کے مارے پھیل گئیں...... سامنے ہی اس کی زندگی کا ٹکڑا...... اس کے سگریٹ منہ میں دبائے ان کو لائٹر سے جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس ایک لمحے میں جیسے اس کی دنیا ہی بدل گئی...... اس کو اپنے روز و شب یاد آنے لگے جب کہ وہ ہر پندرہ بیس منٹ بعد ایک سگریٹ پیتا تھا...... "کیوں...... وہ یہ سگریٹ کیوں پیتا ہے......" شعیب کے دماغ نے اس سے سوال کیا مگر اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سگریٹ پی کر اپنی زندگی جہنم بنانے کا کوئی جواز اس کو نہ مل سکا۔ لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ سگریٹ ناکام اور مصیبتوں کے مارے انسان ہی پیا کرتے ہیں...... وہ تو ایسا نہیں تھا...... اس کے پاس تو خدا کی دی ہوئی تمام نعمتیں تھیں...... زندگی میں سکھ چین تھا...... کوئی پریشانی...... کوئی مصیبت اس کے گھر کا راستہ نہیں دیکھ سکی تھی...... مگر وہ تو خود اپنے گھر کو مصیبتوں میں ڈال رہا تھا...... اپنی زندگی کو آگ اور دھوئیں کی نذر کر رہا تھا...... اور اب...... اس کا بیٹا

"نہیں......" شعیب چلایا اور اس نے جھپٹ کر اسد کے ہاتھ سے لائٹر لے لیا پھر اس نے وہ لائٹر کمرے سے باہر پھینک دیا۔

اسد گھبرا گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں پھونک مار کر منہ سے ساری سگریٹیں... گرا دیں اور رونے لگا۔

شعیب کے آنسو بھی گر رہے تھے مگر وہ رو نہیں رہا تھا۔ اس نے اسد کو کندھے سے لگا لیا اور تھپکیاں دے کر اسے چپ کرانے لگا۔

اس کے پیر فرش پر گری ہوئی سگریٹوں کو کچل کر ختم کرنے میں مصروف تھے............

اُوتھانٹ

اوتھانٹ وہ واحد ایشیائی ہیں جو اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انھیں ڈاگ ہیمرشولڈ کے فضائی حادثے میں ہلاک ہونے کے بعد ۱۹۶۱ء میں اقوامِ متحدہ کا قائم مقام سیکریٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ اگلے سال وہ اقوامِ متحدہ کے تیسرے سیکریٹری جنرل مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد انھیں ۱۹۶۶ء میں دوبارہ اگلے پانچ برس کے لیے سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

اوتھانٹ ۱۹۰۹ء میں برما کے ایک گاؤں پینٹا ناؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق بُدھ مت سے تھا۔ انھوں نے اپنے گاؤں کے اسکول میں انگریزی اور جدید تاریخ کے مضامین کی تدریس سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور ترقّی کرتے کرتے اُسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بن گئے۔ پھر انھوں نے سیاسی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ سے اپنے ملک کی آزادی کے بعد وہ برما کے سربراہ Unu کے مُشیر مقرّر کیے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں وہ اقوامِ متحدہ میں بھی وفد کے رکن منتخب ہوئے اور پانچ سال بعد انھیں اپنے ملک کے وفد کا قائد مقرّر کیا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں وہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ اور اس طرح وہ ایک معتدل اور غیر جانبدار رہنما کی حیثیت سے اقوامِ عالم کے سامنے آئے۔

اوتھانٹ کو امنِ عالم کی کئی مثبت کوششوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۶ء میں جب اقوامِ متحدہ شدید مالی بحران کا شکار ہوگئی تو انھوں نے اپنے تدبّر سے اقوامِ متحدہ کو اس بحران سے نکالا... ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بندی کرانے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔

اوتھانٹ کا انتقال ۲۵ نومبر ۱۹۷۴ء کو نیویارک میں ہوا۔

دُنیا کا سَب سے بَڑا حشرہ (کیڑا)

وزن ۱۰۰ گرام ، نام: گولیتھن ریکس ، مقام: افریقہ

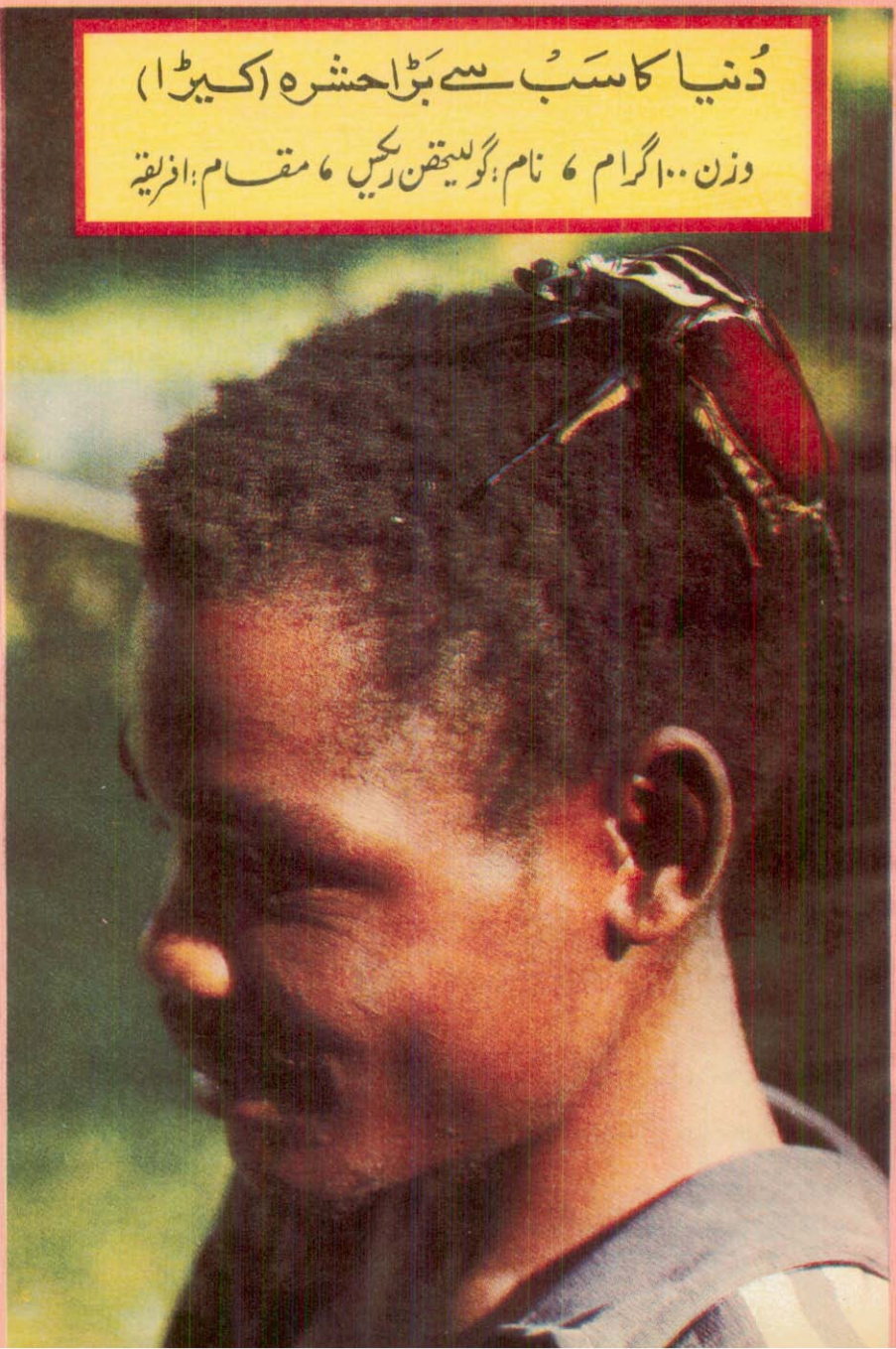

قصّہ ایک سفید خرگوش کا

ثاقبہ رحیم الدین

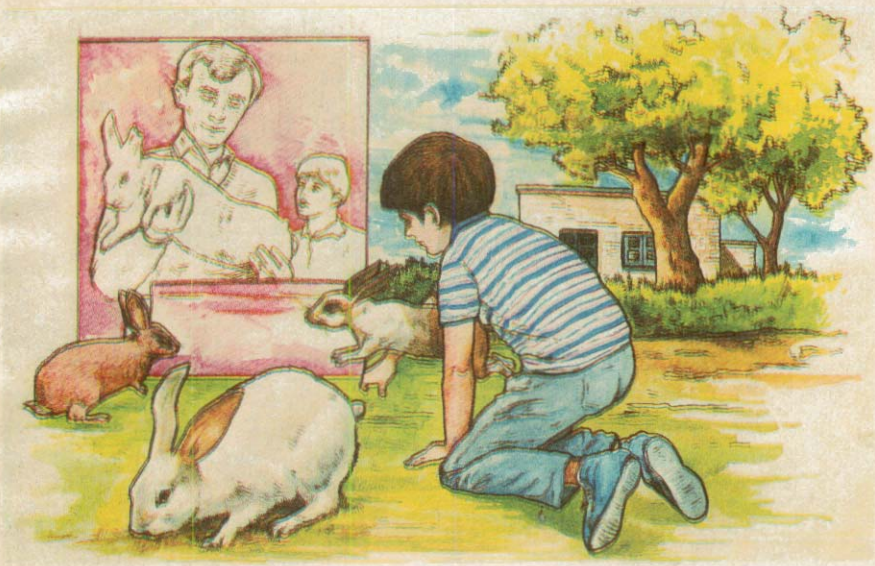

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب جاوید اپنے ابو اور امی کے ساتھ ملیر میں رہا کرتا تھا۔ ابھی پاکستان کے قیام کو چار پانچ سال گزرے تھے۔ ملیر چھاؤنی میں تو انگریزوں کے بنائے ہوئے بیرک نما گھروں کی قطار دور سے نظر آجایا کرتی تھی مگر ملیر سٹی میں ایک "گرینڈ ہوٹل" کی عمارت، ریلوے اسٹیشن اور چند ٹوٹے پھوٹے چائے خانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جاوید میاں لاہور کی بارونق گلیاں چھوڑ کر آئے تھے کیوں کہ ان کے ابو "جامعہ تعلیم ملی ملیر سٹی" میں استاد مقرر ہوگئے تھے۔

ابھی جاوید کے اسکول کے داخلے میں ایک مہینہ باقی تھا۔ اس کی امی اور بہن گھر کا سامان درست کرنے میں مصروف تھیں اور چھوٹے ماموں کو بالٹیوں میں پانی جمع رکھنے کی فکر لگی رہتی تھی۔ جاوید نے گھر سے باہر دیکھا تو کانٹے دار کیکر ہی کیکر نظر آئے یوں تو وہ سفید ٹینس شوز پہنتا تھا مگر ایک دن کیکر کا نوکیلا کانٹا جوتے اور موزے سے گزر کر انگوٹھے میں چبھ گیا تھا۔ اسے دور دور تک ریت ہی ریت نظر آتی تھی۔

اس بات پر جاوید اور تاجی بھائی خوب ہنستے تھے کہ کھارے پانی سے سر دھوتے ہی بال سخت ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور کیا کہنے مرادی مالی کے ..... ملیر میں ہر طرف امرود اور پپیتے کے باغ تھے ..... اور جامن، اور املی کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ مرادی مالی ان بچوں کو کچھ نہ کہتا جو آنکھ بچا کر اپنی جھولی میں کچے امرود لئے دوڑ لیا کرتے تھے۔ جاوید کو وہ مچھلی بہت مزے کی لگتی جو اس کے ماموں مچھیروں سے زندہ خرید لایا کرتے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ جب سب گھر والے سو جاتے تھے اور چاند گوندنی کے درخت کے اوپر آجایا کرتا تھا تو گیدڑوں کے بولنے کی آواز آتی تھی۔ جاوید کو یہ آواز بُری لگتی تھی مگر وہ کبھی ڈرا نہیں۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، اس کچی سڑک پر جو "جامعہ تعلیم ملّی" تک جاتی تھی، جاوید سائیکل چلا چلا کر بور ہو گیا تھا۔ جب جاوید کے ابو نے اسے چپ چاپ اور خاموش دیکھا تو فکر مند ہو گئے۔ پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر جاوید کے ایک چچا کی رائے پر پہلے صحن میں تار کھینچ کر ایک احاطہ بنایا گیا۔ پھر اس میں لکڑی کا چھوٹا سا گھر، مٹی سے لیپ کر بنایا گیا۔ جاوید کی آپا کے ہرے کرتے میں سے ٹکڑا بچا تھا آپا نے اس کا جھنڈا بنا کر گھر پر لگا دیا۔ ملتانی مٹی اور کنکر سے حوض نما برتن بھی بنا دیا گیا ..... جاوید کے ابو شام تک پانچ خرگوش لے آئے۔ ایک خرگوش ماں تھی اور اس کے چار چھوٹے بچے تھے۔ یہ فیملی چڑیا گھر یعنی گاندھی گارڈن میں رہتی تھی اور جگہ کی کمی کے باعث باہر نکالی جا رہی تھی۔

جاوید کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے خرگوشوں کی اس فیملی کو اپنے گھر کے صحن میں آتے دیکھا۔ اس نے اپنے دوستوں تاجی، شاہد، نوید، عفت اور نسرین کو فوراً بلا لیا۔ خرگوش ماں کا رنگ کتھئی تھا۔ اس کے تین بھورے بھورے اور چتکبرے بچے تھے۔ ایک بچہ گول مٹول، گلابی آنکھوں والا اور سفید بگلا سا تھا۔

یہ خرگوش پہلے دو دن تو سہمے سہمے رہے مگر وہ جلد ہی جاوید کی محبت سے مانوس ہو گئے۔ جاوید تار کے پاس کھڑا ہو کر چٹکی بجاتا، چمکارتا اور ہری ہری گھاس سامنے ڈال دیتا ..... دو چار دن بعد جاوید گھر کے پاس بیٹھ جاتا اور برتن صاف کر کے پانی بھرتا۔ خرگوش دیکھتے رہے کہ وہ روز روز آتا ہے، کبھی ٹینس بال اچھالتا ہے، کبھی سیٹیاں بجاتا ہے اور کبھی غبارے میں ہوا بھر کے ڈوری سے باندھ کر چھوڑ جاتا

ہے .... خرگوشوں نے سوچا کہ یہ لڑکا ہمارا دوست ہے کیوں نہ ہم مل جل کر کھیلا کریں۔!

جاوید بڑے خرگوش کو ہمیشہ خرگوش ماں ہی کہہ کر بلاتا اور اس نے تینوں بچوں کے بے معنی سے نام رکھ دیئے۔ یعنی چھوٹو، موٹو اور گوٹو۔ اور سفید خرگوش کو "گلا" کہہ کر بلاتا تھا۔ جب جاوید خرگوشوں کو ہرے ہرے چنوں کے گٹھے ڈال دیتا تو وہ بے حد خوش ہوتے۔ اسی طرح وہ تازی تازی پالک دیکھ کر خوب اچھلتے کودتے تھے۔ جاوید ہفتے میں دو ایک بار خرگوشوں کو نہلاتا تھا کیوں کہ وہ گیلی مٹی سے لت پت ہو جاتے تھے۔

جس طرح ہر انسان کی الگ الگ عادتیں ہوتی ہیں، اسی طرح جانور بھی مختلف مزاج اور ذہانت رکھتے ہیں۔ یوں تو چاروں بھائی چھوٹو، موٹو، گوٹو اور گلا سب ہی ہنس مکھ اور تندرست تھے مگر گلا سب سے پیارا تھا۔ اللہ نے بھی اسے خوش شکل اور سفید بنایا تھا اور وہ اپنی فطرت سے بھی بھولا اور نیک تھا .... چھوٹو پنجرے کے پاس کی نرم زمین پنجوں سے کھودتا اور بڑا سوراخ کر کے نکل بھاگتا تھا۔ شام تک ڈھونڈ کر لایا جاتا اور اس کو ماں خوب ڈانٹتی تھی۔ موٹو کی عادت تھی کہ جلدی جلدی سب بھائیوں کا دودھ اور بھیگی ہوئی ٹھنڈی روٹی کھالیا کرتا تھا۔ موٹو کے پیٹ میں کئی بار درد ہوا اور قے ہوئی۔ جاوید کو اس کی اس حرص پر بڑا غصہ آتا تھا۔ گوٹو کی ایسی گندی عادت تھی کہ ہمیشہ کیچڑ میں کھیلتا تھا۔ پھر ناخن چاٹتا تھا۔ اس کے بالوں میں چھوٹے چھوٹے کیڑے ہو جاتے تھے۔ جب جاوید نہلانے کے لئے لان کا پائپ لاتا تو اتنی تیزی سے دوڑ لیتا کہ کسی کے ہاتھ نہ آتا تھا .... اور ہاں مزے کی بات یہ کہ جب گرمیوں کی دوپہر میں ماں سو جاتی تو چھوٹو، موٹو اور گوٹو گھر سے باہر نکل جاتے اور مرادی مالی سے چھپتے چھپاتے سبزیوں کی کیاریوں میں گھس جاتے۔ کبھی شلجم اور کبھی مولی کے پتے کتر آتے اور کبھی بند گوبھی کی جڑ کے آس پاس مٹی کھود آتے۔

جاوید کو اپنے سارے خرگوش پیارے تھے۔ وہ سب کی حرکتیں دیکھتا تھا۔ وہ کبھی ان کو ڈانٹتا اور کبھی کان کھینچتا تھا۔ دو ایک بار گھر میں بند رکھنے کی سزا بھی دے چکا تھا .... اس خاندان میں صرف گلا ایسا خرگوش تھا جس پر جاوید کو ہمیشہ پیار آتا تھا۔

گلا سچ مچ روئی کا گلا تھا۔ آنکھیں موٹی موٹی اور گلابی۔ جسم گول مٹول اور زمین سے لگا ہوا۔ اسے چمکار دو تو ایسے مسکراتا کہ گود میں لینے کو دل چاہتا تھا۔ وہ دوپہر اور رات میں اپنی ماں کے ساتھ سوتا تھا۔ دن بھر صحن میں اچھلتا کودتا تھا۔ دیوار پر بیٹھی گلہری سے باتیں کرتا اور چہچہاتی چڑیوں کو پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھتا تھا۔ گلا کو گندگی بُری لگتی تھی۔ جب گوٹو کیچڑ میں لوٹتا تھا تو وہ دور رہتا۔ صاف ستھری نالی ہو تو ضرور اپنے ہاتھ پاؤں گیلے کر لیتا تھا اور منہ کو مل کر صاف کرتا تھا۔

گلا ہمیشہ اپنی ماں کا کہنا مانتا تھا۔ وہ اسے جتنا کھانا دیتی وہی کھاتا۔ شام ہونے سے پہلے اپنے گھر

آجاتا۔ گلا کبھی دوپہر میں بھائیوں کے ساتھ سبزیوں کی چوری کرنے نہیں گیا ..... ایک بار چھوٹو نے بہت کہا کہ جاوید کی لال پتنگ جو زمین پر پڑی ہے، اسے پھاڑ آئیں مگر گلا نے یہ بات نہ مانی۔ جب گلا کا کوئی سر سہلاتا تو وہ بھی اپنا منہ کندھے پر رکھ دیتا۔ جاوید اس کے ابو اور سب دوست گلا کو زیادہ پیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ جاوید کے ماموں نے جاوید کے ساتھ گلا کی تصویر کھینچی اور بعد میں فریم کروا کر لاہور لے گئے رفتہ رفتہ گلا کی ٹریننگ ایسی اچھی ہو گئی تھی کہ وہ اشارہ کرتے ہی جاوید کی بال اٹھا لاتا اور اس کے ابو کا اخبار بھی لے کر آجاتا تھا۔

اسی طرح تقریباً چھ مہینے گزر گئے۔ سردیوں کے دن تھے اور چاروں خرگوش گھر سے باہر کھیل رہے تھے۔ چھوٹو موٹو اور گوٹو تو ہمیشہ کے شریر تھے، سوچنے لگے کہ گلا کو بھی ساتھ ملانا چاہئے۔ خاص کر گلا کی تصویر کا اترنا، تینوں بھائیوں کو ذرا پسند نہیں آیا تھا۔ گلا کو لالچ دیا کہ کل تمہیں زیادہ مٹر کی پھلیاں کھانے کو دیں گے ..... اور بھی طرح طرح کی لالچ دی اور تیار کیا کہ چل کر تازی تازی گاجریں اڑائیں۔ شام ہو چلی تھی۔ یہ چاروں گاجروں کی منڈیروں پر اچھل کود رہے تھے گاجر کترتے، کچھ کھاتے اور کچھ بکھیرتے تھے۔ چھوٹو اور موٹو کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

اتنے میں کچھ اندھیرا سا ہونے لگا۔ ایک گیدڑ کی آواز آئی۔ چاروں بھائی گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ گلا کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی .....

اس نے مٹی بھرے ہاتھوں سے آنکھیں ملیں تو اسے اور بھی کچھ نظر نہ آنے لگا۔ گلا کانپنے لگا اور ڈر ڈر کر آوازیں دینے لگا۔ چھوٹو بھائی ..... موٹو بھائی ..... اب گلا کو نظر آرہا تھا کہ یہ تو بھیڑیا ہے جس کی کہانی اسے ماں نے سنائی تھی۔ اس کی تو جان ہی نکل گئی اور سر گھومنے لگا۔ وہ اپنے پنجوں سے زور زور سے مٹی کھودنے لگا اور پھر ہرے ہرے پتوں میں چھپ کر ہانپنے لگا۔ جب بھیڑیا اس کے قریب آیا تو بجائے چھپے رہنے کے، وہ سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگا۔ بھیڑیئے نے اچانک غصے سے منہ مارا اور گلا کا "چپ" سے سفید اور نرم کان کاٹ لیا۔ بہت سا خون نکل آیا اور گلا تکلیف سے بے سدھ ہو گیا۔ نہ جانے کچھ ہری ٹہنیوں کی مدد تھی یا جانے کیا بات تھی کہ وہ لمحہ بھر کو بھیڑیئے کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ وہ خوفزدہ تھا اور پوری طاقت سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا ..... تھوڑی دیر بعد اسے چکر آگیا اور وہ دھپ سے لوسن کی جھاڑیوں میں گر گیا۔ اتنے میں چوکیدار نے سیٹی بجائی۔ بھیڑیئے نے جیسے ہی ٹارچ کی لائٹ دیکھی تو بھاگا ..... چھوٹو، موٹو اور گوٹو نے بھیڑیئے کو دور سے آتے دیکھ لیا تھا اس لئے وہ پہلے ہی کھسک لئے تھے۔

رات آئی اور گزر گئی۔ گلا کو جب ہوش آیا تو صبح ہونے والی تھی۔ وہ روتا جاتا تھا اور دل میں کہتا جاتا تھا کہ میں نے چوری کی تھی اور میرا اللہ مجھ سے خفا ہو گیا ہے ..... ادھر ماں کا بُرا حال تھا۔

اس نے نہ دانا چکھا اور نہ پانی پیا۔ جاوید اسکول جاتے وقت خرگوشوں کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ اسے جو معلوم ہوا کہ گالا نہیں ہے تو غم سے بُرا حال ہوگیا .... غرض کہ ہر طرف ڈھونڈنے سے گالا نظر آیا جو آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جاوید نے کٹے ہوئے زخمی کان پر لال دوا لگائی۔ دودھ میں روٹی بھگو کر کھانے کو دی اور بڑی دیر تک پیار کرتا رہا۔ گالا اچھا ہوگیا اور پھر سے کھیلنے کودنے لگا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ نیک بھولا بھالا اور پیارا لگتا تھا صرف اس کا ننھا سا سفید کان کٹا ہوا تھا۔

جاوید جب بھی سفید، اجلے اور گول مٹول خرگوش گالا کو دیکھتا تو تھوڑی دیر کے لئے اداس ہو جاتا۔ اسے ایسے لگتا کہ جیسے، چھوٹے سے پھول کی ایک پتی توڑ دی گئی ہے۔ ایک دن گالا صبح سویرے ہری ہری گھاس پر اچھلتا کودتا، دوڑتا چلا جارہا تھا۔ اس کی مرغی کے بچوں سے بڑی دوستی تھی اور آج گلہری بھی ملنے آئی تھی جو کسی گھر کے صحن میں پھیلے آلوؤں میں سے ایک ٹکڑا اڑا لائی تھی۔

چھٹی کا دن تھا اور جاوید کے ابو بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ جاوید سے رہا نہ گیا اور پوچھ بیٹھا .... "ابو اللہ میاں کی بھی عجیب عادت ہے کہ شریر اور شیطان چھوٹو، موٹو اور گوٹو کو کبھی سزا نہ دی اور میرے پیارے گالا نے ایک بار غلطی کی اور اللہ میاں نے غصے میں آکر کان کٹوا دیا۔" جاوید کے ابو یہ بات سن کر پہلے تو مسکراتے رہے پھر اٹھ کر گالا کو گود میں لیا اور جاوید کو اپنے پاس بٹھا کر کہنے لگے۔

"دیکھو بیٹے چاہے جانور ہوں چاہے انسان، جو اچھے کام کرتے ہیں دنیا میں، وہ اللہ کے نزدیک بھی پسندیدہ ہوتے ہیں۔ ایک اچھے طالب علم سے استاد سالانہ نتیجے میں زیادہ نمبروں کی توقع کرتا ہے۔ ایک محنتی نوکر سے مالک زیادہ کام کی توقع رکھتا ہے۔ اللہ بھی اپنے پیار کی وجہ سے اچھے انسان سے زیادہ توقعات رکھتا ہے۔ اس کی ذرا سی غلطی پر، اسے دوسروں کی نسبت زیادہ مار پڑتی ہے .... دیکھو بیٹے اسے جلدی سے اچھا بننے کی توفیق بھی تو ہو جاتی ہے۔ اور ہاں جو ہمیشہ ہمیشہ سے بُرے ہیں اور کسی کی نہیں سنتے، بس اپنا وقت پورا کر کے مرجاتے ہیں۔ وہ بھلا کیا کسی کے پیارے بنیں گے یا پیار بانٹیں گے .... سرسوں کے ساگ کی طرح اگے، بڑھے، کچھ کھا لئے گئے کچھ سوکھ ساکھ گئے۔"

فلفے کے پروفیسر اپنے طالبعلموں کو اپنا خواب سنا رہے تھے۔
ایک دفعہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کلاس میں کھڑا لیکچر دے رہا ہوں آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ......

"کیا دیکھتے ہیں؟" طالبعلموں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا
"دیکھتا ہوں کہ میں واقعی کلاس میں کھڑا لیکچر دے رہا ہوں" پروفیسر نے بڑی معصومیت سے جواب دیا

مرسلہ اعزاز حسن۔ اسلام آباد

پھلی گرم

ابنِ آس

گرمیاں آہستہ آہستہ اپنے پیر سکیڑ رہی تھیں۔ اور سردیاں ہم پر لحاف اور رضائیاں مسلط کرنے کے لئے اپنے پر پھیلا رہی تھیں۔ گھر میں ایک میں ہی تھا جسے یہ ٹھنڈا موسم پسند تھا۔ ورنہ راشد اور نعمان تو سردیوں کا نام سنتے ہی کپکپانے لگتے تھے۔

امی کہتی ہیں، "اختر کی توہڈی نہ جانے کس مسالے سے بنی ہے۔ سردی اثر ہی نہیں کرتی۔ لوگ ہلکے پھلکے موسم پسند کرتے ہیں اور اسے یخ بستہ راتیں اور مونگ پھلیاں پسند ہیں۔"

اب اگر مونگ پھلیوں کا ذکر آ ہی گیا ہے تو میں ذرا تفصیل سے بتاتا چلوں کہ مجھے یہ موسم کیوں پسند ہے۔

سردیوں میں اجّو آتا ہے۔ وہ سرد راتوں میں گلی گلی گھومتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین ہوتی ہے جس کی ناکافی روشنی میں وہ اندھیرے کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ میں تنکوں سے بنی ہوئی ٹوکری جس میں گرم گرم پھلیاں اپنی سوندھی سوندھی خوشبو سے بھوک بھڑکانے کا سامان کرتی تھیں۔

جونہی وہ گلی میں آتا، "گرم پھلی گرم" کی مترنم آواز سے سناٹا بکھر جاتا۔ یہ آواز میرے لئے بے

انتہا کشش رکھتی تھی۔ کیوں کہ اجّو میرا دوست تھا۔ بہت گہرا دوست۔

میری اس سے دوستی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو مونگ پھلیاں اور دوسری اس کی مسکراہٹ۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ جب وہ مسکراتا تو بے اختیار اس سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ تھا بھی بہت بھولا بھالا۔ اس کی معصوم مسکراہٹ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ وہ صرف سردیوں میں نظر آتا تھا۔ پھلیوں سمیت۔ گرمیوں میں وہ کہاں ہوتا تھا میں اس کا دوست ہوتے ہوئے بھی اس بات سے بے خبر تھا۔

پھر سردیاں آگئیں۔ وہ بھی آگیا۔ اس کی آمد کا اعلان "گرم پھلی گرم" کی تیز اور کراری آواز نے کیا۔ میں رضائی ایک طرف پھینک کر باہر کی طرف لپکا۔ امی "ارے ارے" کرتی رہ گئیں۔ اور پھر اجّو کی آواز سن کر آپ ہی آپ مسکرانے لگیں۔ نہ معلوم امی خواہ مخواہ بھی کیوں مسکرا پڑتی تھیں۔ مگر یہ وقت ان باتوں پر دھیان دینے کا نہیں تھا۔ باہر اجّو میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں لپکا۔

وہ واقعی میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں خوشی سے چہکا "اجّو"

اس نے ٹوکری اور لالٹین زمین پر رکھ دی اور دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گیا جس طرح وہ مجھے یاد تھا، بالکل اسی طرح میں بھی اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ اس گلی میں آتا، سیدھا ہمارے گھر پر آواز لگاتا "گرم پھلی گرم۔"

"اور سناؤ، باؤ اختر! کیسی گزر رہی ہے؟"

اس نے وہی معصوم مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر کہا جو فطری طور پر اس کے وجود کا حصہ بن گئی تھی۔

"بس دوست۔ مزے میں گزر رہی ہے۔ تم بہت یاد آتے ہو۔"

"اچھا!" اس نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی ہنس پڑا۔ "سچی بات تو یہ ہے باؤ اختر کہ تم بھی مجھے بہت یاد آتے ہو پتہ نہیں کیوں؟" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا، "سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے ملنے کے لئے میں اتنا بے چین کیوں رہتا ہوں۔"

اس کی باتیں مجھے اچھی لگ رہی تھیں۔ میں نے کہا، "اچھا پہلے تو مجھے پھلی دو پھر مجھے بھی تم سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے۔"

وہ قدرے حیران ہوا۔ "مجھ سے! بھلا مجھ سے کونسی ایسی ضروری بات پوچھو گے؟"

"بات تم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے تم سے پوچھوں گا۔"

"پوچھو۔"

"دیکھو اجو! ہماری دوستی کو ماشاء اللہ تین سال ہوگئے ہیں۔ مگر میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"تم کیا جاننا چاہتے ہو ؟"

"یہی کہ تم گرمیوں میں کہاں رہتے ہو صرف سردیوں میں کیوں نظر آتے ہو؟ پورے سال بعد ملتے ہو۔ اور صرف گرم گرم پھلیوں کے بہانے ..... پھلیاں دیں سلام دعا کی اور چلتے بنے۔"

"بس اتنی سی بات! میرے دوست گرمیوں میں نہ آسکنے کی صرف یہ وجہ ہے کہ مجھ میں برداشت نہیں۔"

"کس چیز کی؟"

"گرمی کی ..... تم نہیں مانو گے ..... مگر میرے دوست یہ حقیقت ہے۔ میں گرمی کی معمولی سی لہر بھی برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ اور ....."

میں نے اس کی بات کاٹی کیوں کہ میری نظر اس کے بدن پر پڑی تھی۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ "اجو، کس قدر ٹھنڈ ہے۔ اور تم باریک کپڑے پہنے ہوئے ہو۔ کیا تمہیں ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے۔"

"میں جس مقصد کے لئے اس طرح گلیوں گلیوں میں گھومتا ہوں اس کے لئے برف پر بھی سو سکتا تھا۔ مگر اب میں تھک گیا ہوں میں اچھی طرح جان چکا ہوں کہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گا کیوں کہ میں گرمی برداشت نہیں کر پاتا، دراصل ....."

وہ اپنی بات درمیان میں چھوڑ کر اچانک بولا۔

"بلو اختر، میرا خیال ہے آج میں تمہیں اپنے بارے میں ساری بات بتادوں۔"

میں نے فوراً اس کا ہاتھ تھاما "ہاں، ہاں اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔"

ہم دونوں باہر چبوترے پر بیٹھ گئے۔ پھر وہ بولا۔ "کیا تم نے کبھی ایسے بچے کو دیکھا ہے۔ جس کے ماں باپ گم ہوگئے ہوں۔ اور وہ روتے ہوئے گلیوں گلیوں اپنے بچھڑے ہوئے ماں باپ کو تلاش کرتا پھر رہا ہو۔"

"نہیں....."

"دیکھ لو۔ میں ایسا ہی بچہ ہوں۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا!" میں حیران رہ گیا "مم ..... مگر ..... یار تم روتے تو نہیں ہو۔"

"ہاں میں روتا نہیں ہوں۔ ہر وقت ہنستا رہتا ہوں۔ شاید یہ مسکراہٹ بھی ورثے میں ملی ہے مجھے۔ اور اسی مسکراہٹ کی بدولت میں آج تمہیں اس شہر میں نظر آرہا ہوں۔"

"یعنی اگر تم مسکراتے نہ رہتے تو اس شہر میں نظر نہیں آتے۔" میں نے حیرت سے پوچھا "تعجب کی بات ہے۔"

"ہاں ہے تو تعجب کی بات مگر حقیقت ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے ارد گرد فلک بوس پہاڑ تھے جن پر سال بھر برف جمی رہتی تھی۔ میں نے ان پہاڑوں میں چاچا کو دیکھا جس کے پاس میں رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھا۔ نہیں دیکھا تو صرف ماں اور باپ کو میں نے چاچا سے ایک دن پوچھا "چاچا میری امی میرے ابو کہاں ہیں وہ میرے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ کیا میری امی مجھے ڈھونڈتی نہیں ہوں گی کیا وہ مجھے یاد نہیں کرتی ہوں گی؟"

چاچا رو پڑا۔ میں بہت حیران ہوا۔ اور کہا۔ "کیا بات ہے چاچا آنسو کیوں نکل آئے۔"

اس نے کہا۔ "اجو۔ تیرے ماں باپ شہر میں رہتے ہیں۔ بہت دور جہاں سے میں تمہیں لایا تھا۔ مگر اب میں نہیں جانتا وہ کہاں ہیں۔"

"اگر وہ کھو گئے ہیں تو تم نے انہیں ڈھونڈا کیوں نہیں۔" میں نے پوچھا۔

"بہت ڈھونڈا" چاچا نے جواب دیا۔ "بہت ڈھونڈا۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔"

"مگر چاچا تم مجھے ان کے پاس کیوں لائے تھے؟" میں نے پوچھا۔

وہ سسک پڑا۔ اور روتے ہوئے کہنے لگا۔ "میرے بچے مجھے معاف کرنا۔ میں بہت گنہگار ہوں تجھے تیری ماں کی محبت سے، تیرے باپ کی شفقت سے جدا کرنے والا وہ درندہ شخص ہوں، جس نے تجھے اس وقت اغوا کر لیا تھا جب تو بہت چھوٹا تھا۔"

میں حیرت کے شدید جھٹکے سے لرز کر رہ گیا۔ "نہیں..... نہیں چاچا ایسا مت بولو۔ تم تو بہت اچھے انسان ہو۔ اس قدر سنگ دل نہیں ہو سکتے۔"

وہ آنسو بہانے لگا اور کہا۔ "تو مان یا نہ مان مگر میں ہی وہ درندہ ہوں۔ جس نے صرف تجھے ہی نہیں بلکہ لا تعداد بچوں کو ان کی ماؤں سے جدا کر دیا، مگر تجھے اغواء کرنے کے بعد میں اس کام سے باز آ گیا۔ در حقیقت تو نے مجھے اس دلدل سے نکالا ہے۔"

"میں نے..... مگر کیسے؟"

اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تجھے ایک گھر کے باہر کھیلتے ہوئے اٹھایا تھا۔ تو اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ مگر معصوم بھی تھا، تیری مسکراہٹ میرے دل میں اتر گئی۔ انتہائی عجیب اور معصوم مسکراہٹ تھی۔ میں بچوں کو اغواء کر کے بیچ دیا کرتا تھا۔ مگر نہ معلوم کیوں تجھے فروخت کرنے کو میرا دل نہیں مانا اور میں تجھے اس گاؤں میں لے آیا۔ میں بہت خوش تھا مگر میری خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب میرا اجو کھو گیا۔ پتہ چلا کسی نے اسے اغواء کر لیا تھا۔ میں بہت تڑپا رویا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ بچے

ماں باپ سے جدا ہو جاتے ہیں تو وہ کس قدر تڑپتے ہیں بس اس دن کے بعد میں نے اس کاروبار سے توبہ کر لی۔ پھر میں نے تجھے اپنا بیٹا بنالیا مگر میرا دل تڑپتا رہتا ہے۔ تیرے چہرے کا بھولپن دیکھ کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے۔ اپنے جرم کا احساس ہوتا ہے۔ اب تو تھوڑا بڑا ہو گیا ہے۔ اپنے ماں باپ کو ڈھونڈنے میں میرا ساتھ دے گا۔ ہم بہت جلد شہر چلیں گے۔ وہاں جہاں تیری امی ہیں ابو ہیں بھائی بہن ہوں گے۔ اسکول ہو گا اور ڈھیر ساری کتابیں ہوں گی۔"

چاچا یہ سب کچھ کہہ کر سسک پڑا تھا۔

اور پھر ہم شہر آ گئے۔ وہ مجھے لے کر اس جگہ گیا جہاں سے اس نے مجھے اٹھایا تھا۔ مگر اس عمارت کی جگہ سڑک بن گئی تھی۔ ہم نے گلی گلی چھان ماری۔ مگر میرے ماں باپ کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اور پھر گرمیاں آ گئیں۔ موسم بدلتا ہے لوگ خوش ہوتے ہیں۔ مگر میری زندگی عذاب ہو گئی۔"

"کیا مطلب؟" میں حیران ہوا۔

"یوں نہیں سمجھ پاؤ گے۔ دیکھ لو۔" یہ کہہ کر اس نے لالٹین اٹھائی اور قمیض کے بٹن کھول دیئے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ لالٹین کی پیلی روشنی میں اس کے جسم پر بڑے بڑے گول کالے رنگ کے نشان ابھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"یہ ..... یہ ..... کیا؟" میرے منہ سے نکلا۔

"یہ قدرت کا میرے ساتھ عجیب مذاق ہے۔ معمولی سی گرمی بھی میرا جسم برداشت نہیں کر پاتا ہے۔ اور بڑے بڑے آبلے ابھر آتے ہیں۔ جن میں پانی بھر جاتا ہے۔ اس کی تکلیف ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں گرمیوں میں کبھی نظر نہیں آیا۔ جب میرے جسم پر بڑے بڑے آبلے پیدا ہو گئے تو چاچا نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر اس بیماری کو سمجھ نہیں پائے۔ ایسی عجیب بیماری سے ان کا واسطہ پہلی مرتبہ پڑا تھا۔

آخر چاچا کو گاؤں کے حکیم بابا یاد آئے۔ وہ تجربہ کار آدمی تھے۔ چاچا کا خیال تھا حکیم بابا پرانے آدمی ہیں۔ بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔ وہ ضرور اس بیماری کا توڑ کر دیں گے۔ ہم گاؤں واپس چلے گئے۔ مگر حکیم بابا سے علاج کی نوبت نہیں آئی۔ گاؤں کی سرد آب و ہوا میں پہنچتے ہی آبلے خشک ہو گئے۔ اور آخر ختم ہو گئے۔ صرف نشان رہ گئے۔ حکیم بابا نے بتایا کہ میری جلد میں کوئی خرابی ہے۔ وہ تپش ..... برداشت نہیں کر سکتی ہے اس لئے مجھے گرمی سے بچنا پڑے گا۔

بس اس لئے گرمی بھر اپنے ٹھنڈے گاؤں میں رہے۔ اور اتنے میں چاچا کا انتقال ہو گیا۔ میں اس دن بہت رویا۔ وہ جیسا بھی تھا۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ مگر قدرت نہ معلوم کیوں مجھے نشانہ بنائے ہوئے تھی۔ میں اب دنیا میں تنہا تھا۔ مگر نہیں، میرے ماں باپ تھے نہ معلوم کہاں۔ میں انہیں ڈھونڈنے

کے لئے سردیوں میں پھر شہر آگیا۔ یہاں رہنے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی کام آتا ہو۔ مجھے کوئی کام نہیں آتا تھا۔ میں نے ایک بچے کو پھلیاں بیچتے دیکھا اور پھر دوسرے دن میں نے پھلیاں بیچنی شروع کر دیں۔ رات بھر پھلیاں بیچتا اور دن بھر اپنے والدین کو تلاش کرتا تھا۔ کتنا بڑا بے وقوف تھا۔ بھلا کسی جان پہچان اور نشان و پتہ کے بغیر آج تک کوئی کسی کو ملا ہے۔ خیر میری بے وقوفی تھی۔ جو اب نہیں کروں گا۔ بس پھر میں سردیوں میں شہر آجاتا اور گرمیوں میں واپس چلا جاتا اس درمیان میں تم سے دوستی ہوگئی۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"کیا تم ناامید ہو گئے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے حسرت بھری آواز میں کہا..... "ہاں باؤ میں بالکل ناامید ہو گیا ہوں..... میں اچھی طرح جان گیا ہوں کہ اپنے امی ابو سے کبھی بھی نہیں مل سکوں گا۔ کبھی بھی نہیں..... اگر اتفاقاً سر راہ وہ ملے بھی ہوں گے تو مجھے بھلا کیسے پہچان سکے ہوں گے..... جیسے میں انہیں نہیں پہچان سکا ہوں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اوہ..... میرے لبوں سے افسوس بھری آہ نکلی۔ "کس قدر دردناک ہے تمہاری کہانی..... مگر..... مگر دوست میں دیکھتا ہوں تم جب بھی ملتے ہو اسی طرح مسکراتے رہتے ہو۔ بھلا اس قدر غم تم کس طرح برداشت کرتے ہو۔"

وہ پھر مسکرایا اور بولا۔

"اگر مسکراہٹ سے خوشی کا اظہار ہوتا ہے تو زخمی دل کی پردہ داری بھی تو ہوتی ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا ..... "اچھا باؤ..... میں چلتا ہوں..... اگر قدرت کو منظور ہوا تو پھر ملیں گے۔ شاید اب سردیوں میں بھی تمہیں میری آواز سنائی نہیں دے گی۔"

میں تڑپ اٹھا۔ "نہیں اجو..... ایسی باتیں مت کرو..... تم کل بھی آنا اور روز آیا کرنا..... میں تمہیں یاد کروں گا۔"

وہ ایک بار پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے اچانک ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا گلی کے موڑ پر پہنچ کر اس کی آواز گونجی،

"گرم پھلی گرم۔"

میں گھر میں آیا۔ امی کمرے سے باہر آرہی تھیں شاید مجھے دیکھنے کے لئے۔ مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر بولیں۔

"ارے اختر کہاں چلے گئے تھے۔ میں کتنی پریشان ہو گئی تھی۔"

میں نے کہا "امی میرا دوست تھا نا اجو آج بہت دکھی تھا..... اس سے باتیں کر رہا تھا۔ بے چارہ بہت

دُکھی تھا۔"

"تو بیٹا اسے گھر میں لے آتے۔ دوستوں کو گھر میں بٹھا کر باتیں کرتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ میرے اٹھتے قدم رک گئے۔ ذہن میں جھماکہ سا ہوا۔ اجّو کی مسکراہٹ میری نظروں کے سامنے گھوم گئی تھی۔ میں واپس دوڑا "امی میں ابھی آتا ہوں۔"

باہر آکر میں دیوانہ وار گلیوں میں بھاگتا رہا۔ مگر اجو نظر نہیں آیا اور نہ ہی گرم پھلی گرم کی آواز سنائی دی۔ نا امید ہو کر میں تھکے تھکے قدموں سے واپس آگیا۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھی۔ امی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

وہ دن ہے اور آج کا دن۔ بیس سال گزر چکے ہیں مگر میری آنکھیں اجّو کی مسکراہٹ دیکھنے کو ترس گئی ہیں سردیوں میں جب بھی گلی میں گرم پھلی گرم کی آواز گونجتی ہے میں چونک جاتا ہوں۔ اور لپک کر کھڑکی میں آکر دیکھتا ہوں۔ اور منہ لٹکائے واپس آجاتا ہوں۔ میں نے آج تک امی کو اجو کی حقیقت نہیں بتائی۔ وہ خود ہی اپنے بڑے بیٹے کے بچپن میں گم ہو جانے کے غم میں دل کی مریض بن گئی ہیں۔ اگر انہیں حقیقت حال کا پتا چلتا تو شاید میں بھائی کے ساتھ ساتھ ماں کے پیار سے بھی محروم ہو جاتا۔

اُردو

- ..... اردو کے پہلے شاعر کا نام امیر خسرو تھا۔
- ..... اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد تھے۔
- ..... اردو لکھو، اردو پڑھو، اردو بولو، خواجہ حسن بصری" کا قول ہے۔
- ..... اردو میں جاسوسی ناول سب سے پہلے ظفر عمر زبیری نے لکھا تھا۔
- ..... اردو میں ناول نگاری کا آغاز ۱۸۴۹ء میں ہوا۔
- ..... اردو کا عمر خیام ریاض خیر آبادی کو کہا جاتا ہے۔
- ..... اردو کے مشہور ادیب مولانا ابو الکلام آزاد، مکہ میں پیدا ہوئے۔
- ..... اردو کے مشہور شاعر مومن خان مومن چھت سے گر کر فوت ہوئے تھے۔
- ..... اردو کے سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار ابنِ صفی تھے۔

(مرسلہ:- راشد آدم بلوچ ..... وندر)

میں کون ہوں؟

پروفیسر عنائت علی خان

میں لمبا بھی ہوں گول بھی ہوں
اور لنگڑا اور بے ڈول بھی ہوں

ظاہر میں بدن پر ساڑھی ہے
پر پیٹ میں میرے داڑھی ہے

میں لال بھی ہوں اور پیلا بھی
میں خشک بھی ہوں اور گیلا بھی

ہوں میٹھا اور رسیلا بھی
اور کھٹا اور کسیلا بھی

میں دعوت اکل و نوش[1] بھی ہوں
اور مہر بہ لب خاموش بھی ہوں

میں گرم بھی ہوں اور سرد بھی ہوں
میں عورت بھی ہوں مرد بھی ہوں

تم مجھ کو خوب دباتے ہو
اور کچا بھی کھا جاتے ہو

میں کون ہوں یہ بتلاؤ تم
پھر چُس چُس کر کے کھاؤ تم

[1] کھانا پینا

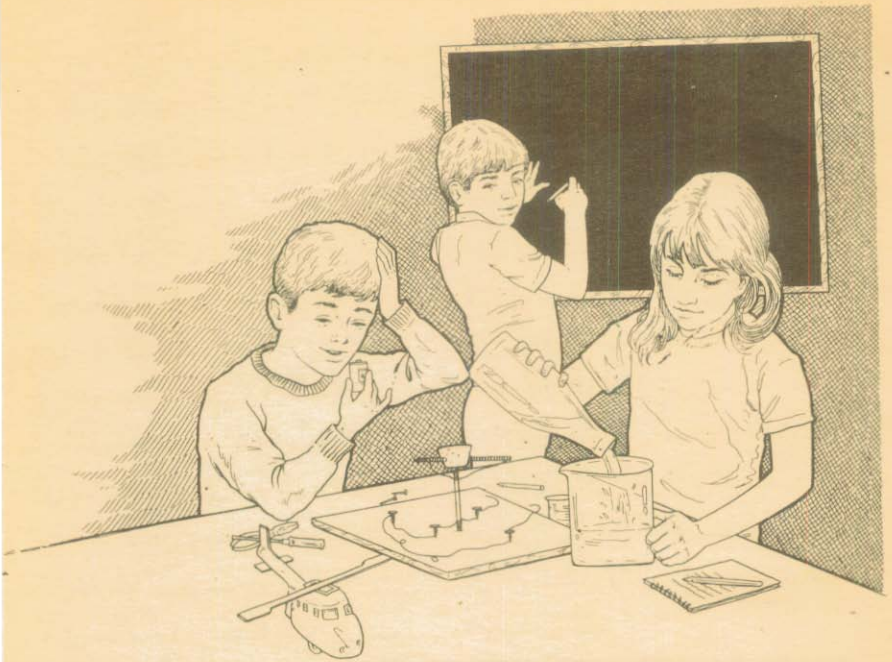

گھر بیٹھے برقی موٹر بنائیں

عدنان فاروقی

اگر آپ سائنس کے طالب علم ہیں تو آپ نے بہت تجربے کئے ہوں گے۔ لیکن شاید آپ نے اب تک برقی موٹر تیار کرنے کا تجربہ نہیں کیا ہو گا۔ آیئے ہم آپ کو اس کا طریقہ بتاتے ہیں۔

اس تجربے کے لئے آپ کو یہ سامان درکار ہو گا شیشے کی نلی 5 c.m لمبی، دو خشک سیل، 4 c.m قطر کا کارک، لوہے کا 15 m.m. لمبا کیل، لکڑی کا بورڈ 20 c.m. 15 c.m. دو موٹے 6 c.m. لمبے کیل، ٹیپ 15 m.m. کیل، اسپرٹ لیمپ، دونوں طرف سے نوکیلا 6 c.m. لمبا کیل، کارک بورر (Cork Borer) لیجئے سامان آپ نے حاصل کر لیا لیکن یاد رکھیئے اگر ان میں سے کوئی بھی چیز آپ کے پاس نہیں ہے تو پھر برقی موٹر کا چلنا مشکل ہے۔ خیر اب ہم آپ کو اس کے بنانے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ شیشے کی نلی لے کر اسپرٹ لیمپ پر گرم کر کے اس کا ایک سرا بند کر دیں پھر کارک میں دو سوراخ ایک

دوسرے کے عموداً کریں جن میں 4c.m. لمبا کیل اور شیشے کی نلی فٹ ہو سکے جیسا کہ شکل نمبر ۱ اور نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے۔ کارک میں دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کے عموداً فٹ کرنے کے بعد تانبے کا تار کیل پر لپیٹ دیں اور تار کے سرے شیشے کی سلاخ کے ساتھ ٹیپ سے لگا دیں۔ یہ خیال رکھیں کہ کسی جگہ پر تار پر ربڑ نہ چڑھا ہو۔ یہ حصے آرمیچر کا کام دے گا۔

لکڑی کے بورڈ پر درمیان میں ایک کیل لگا کر اس پر آرمیچر رکھ دیں۔ (کیل دونوں طرف سے نوک دار ہونی چاہئے) اب چھوٹے کیل چھ سینٹی میٹر لمبے آرمیچر کے دونوں طرف اس طرح گاڑیں کے کہ آرمیچر کے کیل کے سروں سے ۴ کیل کا فاصلہ 4 m.m. ہونا چاہئے۔ ان دونوں کیلوں پر تانبے کی تاریں لپیٹیں۔ دو چھوٹے کیل آرمیچر کے دونوں طرف دو بڑے کیلوں کے عموداً لگائیں۔ یہ دونوں کیل تار کے دونوں سروں کو سہارا دیں گے اور یہ موٹر کے برش کا کام دیں گے۔ جیسا کہ شکل نمبر ۳ میں دکھایا گیا ہے۔ دو چار سیلوں کو سلسلہ دار جوڑیں اور آرمیچر کو تھوڑی سی حرکت دیں۔

موٹر چلنے لگے گی۔ خشک سیلوں کے بجائے ۶ وولٹ کی بیٹری بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

جن بچوں کو برقی آلات سے دلچسپی ہے وہ برقی موٹر بنانے کی کوشش کریں انشاء اللہ وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

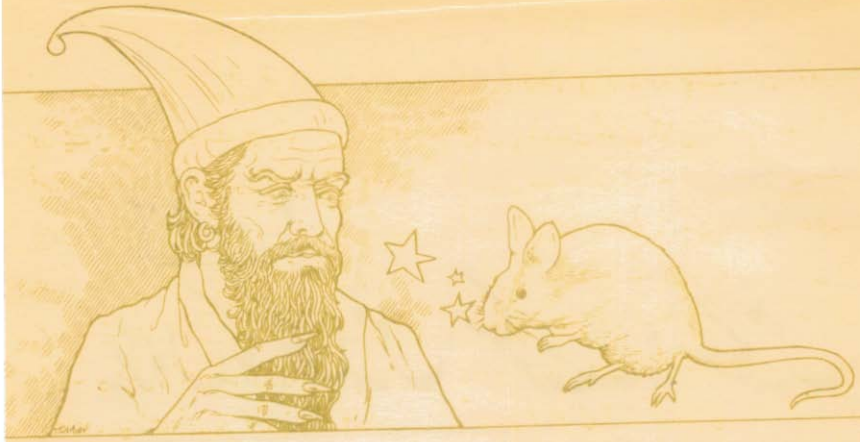

چوہے کا چوہا

عنبر چغتائی

چوہے نے بلّی کے ڈر سے
جا کے کہا اک جادو گر سے.

"بلّی کا ڈر نکلے دل سے،
ورنہ کیسے نکلوں بل سے!"

جادوگر کو رحم جو آیا
جادو کر کے بلّی بنایا

پھر وہ بولا بلّی بن کر.
"مجھ کو اب ہے کتّوں کا ڈرا!"

کتّا بن کر بولا چوہا:
"کھا جائے گا مجھ کو چیتا!"

بولا پھر وہ چیتا بن کر.
"اب تو ڈر ہے اس سے بڑھ کر،

"مجھ کو اپنی جان ہے پیاری
کب چھوڑے گا مجھے شکاری!"

جادوگر کو غصہ آیا،
چوہا اس کو پھر سے بنایا

بولا "کب اس قابل تو ہے!
چوہا رہ تو بزدل چوہے"

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں، سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر موذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط اردوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو بھر ـــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچوں کی طرح... آئیے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آئیے مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنائیے۔

نئے لکھنے والوں کی مختصر تحریروں کا مستقل سلسلہ

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہوسکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک لسٹ" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔ (ادارہ)

میاں جی

سہیل سرور بلوچ

کھاتے نہ اگر کشتے ملتان میاں جی
ہوتا نہ کبھی آپ کو یرقان میاں جی
کام ایسے بھی کرتا ہے یہ انسان میاں جی
شیطان بھی ہوتا ہے حیران میاں جی
سامان جو اپنا تھا کہاں چھوڑ دیا ہے
یہ کس کا اٹھا لائے ہیں سامان میاں جی
ممکن ہو تو ٹوپی سے اسے ڈھانپ کے رکھیں
سر لگتا ہے اب کھیل کا میدان میاں جی

خواہش

عدیل اسلم

"ابو مجھے سائیکل لے دیں نا۔" یہ امجد کی آواز تھی جو روز کی طرح آج بھی اپنے ابو کو سائیکل لانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ امجد کے ابو ایک معمولی دفتر میں ملازم تھے تنخواہ میں بس عزت سے دال روٹی چل رہی تھی لیکن ان کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ

امجد کو سائیکل لے کر دے سکیں۔ امجد کی جیب کا خرچہ بھی بڑی مشکل سے نکلتا تھا۔ ان حالات میں وہ سائیکل نہیں لے سکتے تھے انہوں نے امجد کو ٹالتے ہوئے کہا "اچھا بیٹے لے دیں گے۔" لیکن امجد آج اٹل ارادہ کر کے آیا تھا "لیکن کب لے کر دیں گے۔" "جلدی ہی لے دیں گے۔" امجد کے ابو نے کہا۔ "لیکن مجھے ابھی چاہئے۔" امجد نے کہا۔ "کمانا لے دوں گا" امجد کے ابو نے غصے سے کہا۔ امجد رونی صورت بنا کر بولا "میرے سب دوستوں کے پاس سائیکل ہے وہ اس پر اسکول جاتے ہیں گھومتے پھرتے ہیں سب کے پاس سائیکل ہے تو میرے پاس کیوں نہیں ہے۔" اچانک اسکے ابو کے دماغ میں ایک ترکیب آئی اور وہ فوراً بولے "ٹھیک ہے ابھی تو میں کسی کام سے جارہا ہوں شام کو چلیں گے۔" امجد خوشی کے مارے چھلانگیں لگانے لگا اور بے چینی سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ شام کو جب اس کے ابو گھر آئے تو امجد تیزی سے ان کی طرف بڑھا تاکہ انہیں اپنا وعدہ یاد کروائے۔

تھوڑی دیر بعد امجد اور اس کے ابو باہر نکل گئے۔ سے کافی حیرانی ہوئی کیوں کہ سائیکلوں کی دکان کی طرف جانے کا دوسرا راستہ تھا۔ لیکن اس کے ابو کہیں ور جارہے تھے۔ خیر وہ چلتا رہا۔ راستے میں وہ ایک ریب بستی سے گزرے جہاں کئی بچے جنہوں نے پڑوں کے چیتھڑے پہنے ہوئے تھے پھر رہے تھے۔ ہر رف مفلسی ہی مفلسی تھی۔ امجد نے ایک لڑکے کو یکھا جسے اس کا باپ مار رہا تھا۔ اور وہ رو رہا تھا۔ امجد نے سوچا میرے ابو نے تو کبھی مجھے ایسے نہیں مارا۔ کئی

چھوٹے چھوٹے بچے گندی گندی نالیوں کے پاس کھیل رہے تھے۔ کیچڑ سے ان کے ہاتھ بھرے ہوئے تھے۔ سارے راستے وہ کچھ سوچتا گیا آخر ایک دم اس نے اپنے ابو کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "ابو میں سائیکل نہیں لوں گا۔" "کیوں بیٹا!" امجد کے ابو نے نرمی سے پوچھا۔ "اس لئے کہ میں وہ بات سمجھ گیا ہوں جو آپ مجھے سمجھانا چاہ رہے تھے۔ آج مجھے احساس ہوا کہ اس ملک میں ایسے بچے بھی ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ میرے پاس تو سائیکل نہیں ہے لیکن ان کے پاس علم حاصل کرنے کے پیسے نہیں انہیں کوئی خوشی میسر نہیں۔ ان کا مستقبل کتنا تاریک ہے میں ہمیشہ اپنے سے بڑے لوگوں کی طرف دیکھتا رہا ہوں میں نے ایسے لوگوں کا نہیں سوچا جو کوئی چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے۔" امجد کے ابو نے اسے پیار کیا اور کہا "ہاں بیٹا میں جانتا تھا کہ تم میری بات سمجھ جاؤ گے تم سمجھدار بچے ہو اور پھر وہ دونوں واپس لوٹ گئے۔ دونوں کے دل حقیقی خوشی سے لبریز تھے۔

دیا سلائی

ملک خلیق احمد ناز

آج سے ہزار ہا سال پہلے دنیا کے لوگ جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ ان کی خوراک صرف درختوں کے پھل اور شکار کیا ہوا گوشت تھا۔ جنگل کے جانور انہیں اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اور جب بھی موقع ملتا ان پر حملہ کر دیتے تھے۔ لوگ اپنے گھر درختوں پر یا ان کی کھوہوں میں بناتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا والے آگ سے نا آشنا تھے۔ اسی زمانے کی بات ہے ایک رات بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک کے ساتھ طوفان شروع ہوا۔ لوگ سہم گئے۔ یکایک بجلی دھماکے کے ساتھ ایک درخت پر گری۔ لوگوں نے دیکھا کہ درخت جل رہا ہے۔ اور اس سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ وہ سمجھے کسی دیوتا نے ان پر عذاب نازل کیا ہے۔ وہ ڈرتے سردی سے کانپتے اس کے قریب آئے۔ تو انہوں نے محسوس کیا۔ کہ اب انہیں سردی نہیں لگ رہی اور ان کے اندر حرارت دوڑنے لگی ہے۔ وہ آگ کی اس طاقت پر تعجب کرنے لگے۔ قبیلے کے تمام لوگ جو سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ آگ کے گرد جمع ہو کر اپنا جسم سینکنے لگے۔ تب انہوں نے جانا کہ یہ کسی دیوتا کا قہر اور غضب نہیں۔ بلکہ شفقت و رحمت ہے۔ انہوں نے دیوتاؤں کے اس تحفے کو جان سے زیادہ محفوظ رکھا اور اسے پوجنے لگے۔ ایک دن ایک آدمی کسی جانور کے پیچھے چقماق کا پتھر اٹھائے بھاگ رہا تھا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے غصے میں آکر چقماق کا پتھر دوسرے پتھر پر دے مارا۔ اس کے تعجب کی انتہاء نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ پتھر پر پتھر لگنے سے آگ پیدا ہوئی۔ جب اس نے یہ بات قبیلے والوں کو بتائی تو عقل مند آدمی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اور فیصلہ کیا کہ خشک پتے چقماق کے پتھر پر لپیٹ کر انہیں ٹکرایا جائے تو اس سے آگ پیدا ہو سکتی ہے۔ جب اس قسم کا تجربہ کیا گیا تو وہ کامیاب ہوا۔ ہزاروں سال بعد جب گندھک، فاسفورس، اور پٹاس کے فوائد کا لوگوں کو علم ہوا۔ تو دیا سلائی ایجاد ہوئی لیکن پرانی اور آج کی دیا سلائی میں بڑا فرق ہے۔ سب سے پہلے جو دیا سلائی ایجاد ہوئی اس کے سرے پر پوٹاشیم، کلوریٹ، گوند اور کھانڈ لگی ہوتی تھی اور جب اس کو گندھک کے تیزاب میں ڈبویا جاتا تو آگ پیدا ہوتی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس کی اصلاح کی گئی۔ اور رگڑ سے جلنے والی دیا سلائی بنائی گئی۔ جو آج کل استعمال کی جاتی ہے۔ انہیں سیفٹی ماچس یعنی محفوظ دیا سلائی کہتے ہیں۔ ان کے سرے پر انٹی منی سلفائڈ، پوٹاشیم۔ اور سرخ وارنش لگائی جاتی ہے اور پھر ڈبیا پر سائیڈ میں فاسفورس، انٹی منی سلفائڈ، پسے ہوئے شیشے اور شیرش کی ملاوٹ کا لیپ کر دیا جاتا ہے، آج کل تمام دنیا میں اس قسم کی دیا سلائیاں استعمال کی جاتی ہیں۔

اسلامی کوئز

مرسلہ۔ رفعت اللہ

۱۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی زوجہ کا نام "رملہ" تھا۔
۲۔ حضرت یعقوبؑ کی زوجہ کا نام "راخیل" تھا۔
۳۔ حضرت یوسفؑ کی زوجہ کا نام "زلیخا" تھا۔
۴۔ حضرت لوطؑ کی زوجہ کا نام "اھلہ" تھا۔
۵۔ حضرت ایوبؑ کی زوجہ کا نام "رحمہ" تھا۔
۶۔ حضرت اسحاقؑ کی زوجہ کا نام "رفقاء" تھا۔
۷۔ حضرت الیاسؑ کی زوجہ کا نام "بن حتیٰ" تھا۔
۸۔ حضرت موسیٰؑ کی زوجہ کا نام "صفیہ" تھا۔
۹۔ حضرت سلیمانؑ کی زوجہ کا نام "بلقیس" تھا۔
۱۰۔ حضرت زکریاؑ کی زوجہ کا نام "ام کلثوم" تھا۔

خالہ امرودی

نبیل احمد، پشاور

ہمارے محلے میں ایک بڑی بی رہا کرتی تھیں۔ نام تو ان کا "آمینہ خانم" تھا لیکن محلے بھر میں "امرودی خالہ" کے نام سے مشہور تھیں۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے محلے کے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دے کر اور کپڑے سی کر اپنی تنہا ذات کا خرچا برداشت کرتی تھیں۔ امرودی خالہ کے مرحوم شوہر کے کوہاٹ میں امرودوں کے کئی باغات تھے اس لئے ان کا یہ نام پڑا اور کوئی ان کے امرودوں سے دلی رغبت کی بنا پر انہیں اس نام سے پکارتا، الغرض جتنے منہ اتنی باتیں ایک قصہ یہ بھی تھا کہ خالہ کو اپنے گھر کے دالان میں کھڑے امرود کے درخت سے بہت پیار ہے اور یہی قصہ ہمیں حقیقت لگتا تھا۔

پہلے پہل ہم جب خالہ امرودی کے محلے میں آئے تو ہماری عمر گیارہ، بارہ کے لگ بھگ تھی اور ہم فطرتاً بہت شرارتی واقع ہوئے تھے۔ اور ہماری شرارتیں اس وقت اور بھی بڑھ جاتیں جب ہم اپنے "ڈینجر اسکواڈ" کے ساتھ مل کر نت نئے منصوبے تشکیل دیتے۔ ہمارا یہ "ڈینجر اسکواڈ" شکیل، عاصم، فیصل، عامر، فرحانہ اور پارو پر مشتمل تھا۔ ہمارے "ڈینجر اسکواڈ" کے قابل ذکر کارناموں میں رشیدا پھوپھو کے فریج کا صفایا، پپو میاں کا سر پھاڑنا، چاچا پنکچر کی برائے نام "پھٹ پھٹی" کے ٹائر پھاڑنا اور گلی کے نکڑ پر واقع ببن حلوائی کو بغیر پیسے دیئے مٹھائی حاصل کرنا تھے۔

جیسے ہی مارچ کے مہینے نے سر ابھارا ہمارا "ڈینجر اسکواڈ" بدنظمی کا شکار ہوگیا جس کی وجہ ہر ممبر کے سالانہ امتحان تھے۔ آخر اللہ اللہ کر کے یہ بری گھڑی ٹلی تو ہماری تنظیم پھر حرکت میں آگئی۔ اب سب سے پہلے جس پروگرام پر عمل کرنے کا تہیہ کیا گیا تھا وہ "خالہ امرودی" کے گھر میں واقع امرود کے پیڑ پر ڈاکے کا تھا۔

مقررہ تاریخ کو دوپہر تین بجے ڈینجر اسکواڈ نے اپنے مشن ۰۰۷ کا آغاز پروگرام کے مطابق کر ڈالا پروگرام

کے مطابق عاصم اور شکیل نے خالہ امرودی کو دالان سے دور لے جا کر باتوں میں لگانا تھا۔ میں نے اور فرحانہ نے پیڑ پر چڑھ کر امرودوں کو توڑ توڑ کر نیچے پھینکنا تھا اور پارو اور عامر نے انہیں اکٹھا کر کے تھیلوں میں بھرنا تھا۔ اور اس کے بعد وہاں سے فرار ہو کر "بلیدی باغ" جو کہ ہمارے محلے سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر اپنی شادابی کے ساتھ موجود تھا۔ پہنچ کر امرودوں کا صفایا کرنا تھا۔ عاصم اور شکیل پروگرام کے مطابق خالہ امرودی کو لے کر پچھلے صحن کی جانب چل دیئے۔ اور ہم بمعہ فرحانہ صاحبہ پیڑ پر چڑھنے کے لئے خالہ امرودی کے صحن میں اتر آئے۔ عامر اور پارو نے جلدی سے اپنی بغلوں میں چھپائے ہوئے تھیلے نکال کر کمال ہوشیاری سے پکڑ لئے۔ غرض یہ کہ ہر کام پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا اور ہم "ڈینجر اسکواڈ" کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے خوشی سے گارڈن ..... گارڈن ہوئے جا رہے تھے کہ ڈینجر اسکواڈ کا یہ آپریشن بھی اب کامیاب ہوا ہی چاہتا ہے۔

پارو نے پیڑ پر چڑھ کر ہمیں اوپر آنے کو کہا ہم جو کہ خیالی دنیا میں اپنے آپ کو وکٹری اسٹینڈ پر کھڑا دیکھ رہے تھے۔ جلدی سے پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم نے اپنا ایک ہاتھ دیوار پر رکھا (جو کہ پیڑ کے ساتھ ہی موجود تھی) اور اپنا داہنا پیر بمعہ بقایا ٹانگ پیڑ کی ایک مضبوط شاخ پر جمایا ہی تھا کہ ہمیں اپنی ہاتھوں کے نیچے سے دیوار نکلتی نظر آئی۔ اور اس کے بعد ہمیں ہوش اس وقت آیا جب ہم ایک مقامی ہسپتال کے بیڈ پر موجود تھے۔ اور ابو، امی اور خالہ امرودی ہمیں پیار بھری نظروں سے گھور رہے تھے۔

خیر جب ہم گھر آئے تو ہمیں پتہ چلا کہ ہم نے جس دیوار پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اس کی اینٹوں کو اوپر سے بغیر سیمنٹ کے ہی جوڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔ اور ہم نے اس طرف دھیان نہیں دیا جس کی سزا ہمیں ملی۔ ہسپتال میں ہمیں خالہ امرودی نے پیار بھری نظروں کے علاوہ ایک اور تحفہ بھی دیا تھا اور وہ تھا امرودوں سے بھرا ہوا ٹوکرا جسے ہم نے صحت یاب ہونے کے بعد اپنے ڈینجر اسکواڈ کے ساتھ بلیدی باغ میں مزے لے کر اڑایا۔

اس واقعہ کے بعد خالہ امرودی کی شخصیت کے ساتھ وابستہ واقعات کی فہرست میں ایک اور واقعہ کا اضافہ ہو گیا۔ بڑوں میں تو نہیں لیکن محلے کے بچوں میں خالہ کی مقبولیت بڑھ گئی معلوم نہیں خالہ کے نام کے ساتھ ابھی اور کتنے قصے وابستہ ہونے باقی ہیں؟

قائداعظمؒ اور اسلام

مرسلہ۔ غلام عباس طاہر..... شورکوٹ

عظیم مسلمان کون ہے؟ کیسا ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ وہی ناں جس کا کردار عام مسلمانوں سے بڑھ کر ہو جس کے کردار میں مومن کی شان پائی جائے بلند نگاہ دیانت دار، صادق اور انصاف پسند ہو، انہی باتوں کی روشنی میں ہم اپنے محبوب قائد کو پرکھتے ہیں۔ یہ وہی قائداعظم ہیں جنہوں نے اس وقت اس قوم کو سہارا دیا جس کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ یہ وہی قائداعظم ہیں جس نے ۹ جولائی ۱۹۴۵ء کو شملہ میں کہا "ہر وہ تجویز جو میرے خیال

میں مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو گی روئے زمین کی کوئی طاقت مجھے قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکے گی۔" "لنکن ران" میں صرف اور صرف اس لئے داخل ہوئے کہ اس کے دروازے پر لگی ہوئی دنیا کے عظیم قانون دانوں کی فہرست میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نام نامی سرفہرست تھا۔ جب بمبئی کی مس رتن بائی نے آپ کو شادی کا پیغام دیا تو آپ نے کہا "پہلے اسلام قبول کرو پھر شادی ہو گی" ساری دنیا جانتی ہے کہ ۱۸ اپریل ۱۹۱۸ء کو محترمہ رتن بائی نے اسلام قبول کیا اور ۱۹ اپریل کو شادی ہوئی۔

آپ کے ملکی اور ملی خدمات کے پیش نظر سب سے بڑے سیاسی حریف مسٹر گاندھی نے کہا "انہیں (قائداعظم) نہ کوئی خرید سکتا ہے نہ وطن و ملت کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔" اسی طرح مشہور سیاست دان مسٹر گوکھلے نے آپ کی خدمت کا یوں اعتراف کیا "محمد علی جناح ان تمام خوبیوں کے مالک ہیں جو ایک مسلم قائد میں ہونی چاہیں۔" اینگلو عربک کالج دہلی میں مسلم خواتین و طالبات سے فرمایا "اب مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ متحد ہو جائیں وہ شیعہ سنی اور وہابی کے امتیاز کو بالائے طاق رکھ دیں۔" پاکستان کے آئین کے متعلق فرمایا "ان کے پاس تیرہ سو برس سے ایک مکمل پروگرام موجود ہے اور وہ "قرآن مجید" ہے۔

بکھرے موتی

شائستہ اسلم

(۱) کردار ایک مالا ہے جس کا اگر ایک موتی بھی ٹوٹ کر بکھر جائے تو ساری مالا بکھر جاتی ہے۔

(۲) خودداری سے اپنے مقاصد حاصل کرو کیونکہ ہو گا وہی جو مقدر میں ہو گا۔

(۳) انسان کا شیطان بن جانا اسکی شکست ہے۔

(۴) انسان کا حلیم بن جانا ایک معجزہ اور انسان کا انسان بن جانا ایک فتح ہے۔

(۵) اس بادل کی طرح رہو جو پھولوں پر ہی نہیں کانٹوں پر بھی برستا ہے۔

(۶) زبان کی شکوہ شکایت سے روک لو تو خوشی میسّر آجائے گی۔

دنیا کے مشہور شہر

سراج امان اللہ

مسجدوں کا شہر	ڈھاکہ
بازاروں کا شہر	قاہرہ
فلک بوس عمارتوں کا شہر	نیویارک
بھارت کا روم	دہلی
زمین کی جنّت	کشمیر
پیغمبروں کی سرزمین	فلسطین

اقوال زریں

مرسلہ۔ فرحانہ رانی، شہداد پور

۱۔ بزدل انسان، موت سے پہلے بھی کئی بار مرتا ہے مگر

بہادر انسان صرف ایک بار مرتا ہے۔
۲۔ کسی کام میں تاخیر کرنا دن میں جلتے ہوئے چراغ کی روشنی کو ضائع کرنا ہے۔
۳۔ اس دنیا میں اتنی بلند دیواروں والے محلوں میں نہ رہو جس میں تمہاری آواز گھٹ کر رہ جائے۔

بلا عنوان

توفیق سجاول، اسلام آباد

وہ آج صبح سے بھوکا تھا۔ آج صبح سے اس کے پیٹ میں ایک دانہ تک نہ گیا تھا۔ احمد ایک یتیم لڑکا تھا۔ اس کے والدین اسے چھوٹی سی عمر میں چھوڑ کر چلے گئے تھے..... اب تو انہیں بھی دو برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ان دو سالوں میں اسے کیا کیا تجربے نہیں ہوئے تھے اور کن کن مصائب سے اسے گزرنا نہ پڑا تھا۔ وہ تلخ تجربات کی بھٹی میں جل کر کندن بن چکا تھا..... اتنی چھوٹی سی عمر میں اسے ایسے ایسے تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا کوئی اور آدھی عمر میں بھی نہ کر سکے۔ اب دنیا نے اسے کافی کچھ سکھا دیا تھا وہ دنیا میں رہنے کا اصل طریقہ سیکھ گیا تھا اسے پتا چل گیا تھا کہ اس ظالم دنیا میں کون زندہ رہ سکتا ہے..... کون سکھ سے رہ سکتا ہے؟

مسلسل بھوکا رہنے کی وجہ سے انتڑیاں صدائیں دے رہی تھیں کہ اسے کچھ کرنا ہے..... کچھ کھانا ہے!

"مزدوری" اس نے دل میں سوچا "ہونہہ! دنیا والوں نے بچہ سمجھ کر نہ دی اور اگر دی بھی تو تنخواہ نہ ہونے کے برابر۔"

"نوکری؟....." "ہونہہ! نوکری اتنی سی عمر میں اسے مل نہ سکی تھی اسکول..... مفت تعلیم دلوانے والے ادارے تھے تو سہی جہاں بچوں کو کھانا بھی مفت ملتا ہے! مگر سفارش! اس کے پاس سفارش نہ تھی۔ احمد ہر حربہ آزما چکا تھا لیکن اسے کسی نے بھی قبول نہ کیا۔ اب اس کے پاس واحد ذریعہ تھا اپنا پیٹ بھرنے کے لئے..... اپنے پیٹ کے دوزخ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اور وہ تھا "چوری"۔

"ہاں میں چوری کروں گا" یہ احمد کے دماغ کی باغیانہ سوچ تھی۔ اس سوچ جسے اس نے آج سے پہلے ہمیشہ برا سمجھا تھا۔ مگر اب..... اب یہ اس کی مجبوری بن چکی تھی۔ اس نے پکا فیصلہ کر لیا کہ وہ چوری کر کے اپنے پیٹ کو بھرے گا۔ اب اس کے دماغ میں صرف یہ صدائیں گونج رہی تھیں۔ "ہاں میں چوری کروں گا..... چوری کروں گا۔"

احمد سڑک کے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک ٹھیلے والے کے پاس آ پہنچا۔ اس ٹھیلے والے نے اپنا ٹھیلہ سڑک کے کنارے رکا رکھا تھا۔ احمد نے للچائی ہوئی نظروں سے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھیلے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور جیسے ہی ٹھیلے والے نے کوئی چیز اٹھانے کے لئے منہ نیچے کیا تو احمد نے تیزی سے بن کباب اٹھایا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ دکاندار نے چور چور کا شور مچاتے ہوئے اسے قمیض کے کالر سے پکڑ لیا۔ احمد سخت بدحواس ہو گیا اس نے تیزی سے کالر چھڑایا اور بھاگ نکلا۔ وہ ابھی سڑک کے بیچوں بیچ تھا کہ ایک ٹرک نے آکر اسے ٹکر مار دی۔

سڑک پر خون ہی خون بکھر گیا............

تھوڑی دیر تک تو لوگ ادھر جمع ہو کر کھڑے چہ مگوئیاں کرتے رہے پھر واپس اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ جیسے یہ ان کے لئے معمولی بات ہو اس خون پر کسی نے حیرت کا اظہار نہ کیا اور نہ ہی یہ کہا کہ "بیچارہ بچہ! کتنا معصوم ہے" اور نہ ہی ٹرک والے کو کوسا کیوں کہ یہ ایک یتیم لڑکا تھا۔ البتہ چند خدا ترس لوگوں نے یہ ضرور کہا "شائد یہ بھوکا تھا" مگر یہ سوال کسی ذہن میں نہیں گونجا کہ ذمے دار کون تھا اور اسکے خون کا گناہ کس کے سر گیا ہے؟

زمین کے بارے میں اہم معلومات

مرسلہ۔ عدنان رفیق پشاور

۱)...... زمین کی عمر تقریباً ساڑھے اکتالیس ہزار سال ہے۔

۲)...... زمین کا کل رقبہ ۴۰۰، ۹۴۰، ۱۹۶ مربع میل ہے۔

۳)...... زمین پر سب سے اونچا مقام ماؤنٹ ایورسٹ نیپال میں واقع ہے۔

۴)...... زمین پر سب سے نیچا مقام بحیرۂ مردار ہے۔

۵)...... زمین سورج کے گرد ۶۰۰، ۶۶ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگاتی ہے۔

۶)...... زمین اپنے مدار کے گرد ۱،۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے۔

۷)...... زمین اپنے مدار کے گرد ایک چکر ۲۳ گھنٹے اور تقریباً ۵۶ منٹ میں پورا کرتی ہے۔

انڈونیشیا

مرسلہ۔ نسیم انور، فیصل آباد

۱۔ انڈونیشیا کا سرکاری نام ریپبلک انڈونیشیا ہے۔

۲۔ انڈونیشیا کا دارالحکومت جکارتہ ہے۔

۳۔ انڈونیشیا نے ۱۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو جاپان سے آزادی حاصل کی۔

۴۔ انڈونیشیا ۱۳ ہزار ۵ سو جزیرہ پر مشتمل ہے۔

۵۔ انڈونیشیا کے کل ۲۸ صوبے ہیں۔

۶۔ انڈونیشیا کی کرنسی کا نام روپیا ہے۔

۷۔ انڈونیشیا کی آبادی ۱۸ کروڑ ۷۷ لاکھ ۲۶ ہزار ہے۔

۸۔ انڈونیشیا کا کل رقبہ ۷ لاکھ ۳۵ ہزار ۲ سو ۶۸ مربع میل ہے۔

۹۔ انڈونیشیا میں مسلمانوں کی تعداد ۸۸ فیصد ہے۔

۱۰۔ انڈونیشیا کی شرح خواندگی ۷۲ فیصد ہے۔

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں

نقل شدہ، طویل اور غیر معیاری تحریریں شائع نہ ہو سکیں گی

اپنی نگارشات صاف خوشخط کاغذ کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں

ہم ہار گئے لیکن

محمد رضوان اورنگی

عید کا دن ہمارے لئے خوشی کے اسٹروک اور مسرتوں کے رنز لے کر آتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ دن ہمارے لئے خوشگوار اور پر مسرت لمحات کی سنچری ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مرتبہ ہم نے اس موقع کو جانے نہیں دیا۔ کیوں کہ اس میں ہماری فلاح تھی اس بار گھر سے عیدی نہ ملنے کی وارننگ مل چکی تھی۔ وہ اس لئے کہ بیٹ پیڈ اور گیند کا بجٹ اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ پس اب ان سے صرف فائدہ اٹھانا تھا۔ جس کا ہم نے پروگرام بنایا۔

لہٰذا عید سے ایک دن قبل ٹورنامنٹ کروایا گیا۔ طے یہ پایا کہ جو ٹیم جیتے گی اسے کپ اور اچھی کارکردگی کرنے والے کھلاڑی کو عید کا "مین آف دی میچ" یعنی دو سو روپے دیئے جائیں گے ہماری ٹیم اپنے علاقے کی چیمپئن تھی اور ہم اس کے کپتان ہمیں توقع تھی کہ عید تو ہماری ہی اچھی ہوگی۔ مارے خوشی کے ہم سنبھل نہ رہے تھے۔

ٹاس ہوا۔ جو ہم کبھی بھی نہیں ہارے تھے۔ خوشی کے مارے ہار گئے۔ خیر مخالف ٹیم نے دو سو رنز بنا کر ہمیں بیٹنگ دی۔ شاید وہ فی رن ایک روپیہ لینا چاہتے تھے۔ ہماری ٹیم کے اوپننگ بیٹسمین اقبال یعنی مدثر اور ہم خود یعنی شعیب ہیں۔

پہلا اوور میڈن گیا۔ یعنی مدثر کوئی رن نہ بنا سکے۔ ہمیں بڑا غصہ آیا۔ اور آخر ہم کپتان تھے اور پھر عیدی کے طالب بھی، پہلی ہی گیند قادر کی طرح کرائی گئی۔ چاہا کہ چھکا لگاؤں لیکن پھر خیال آیا کہ "مین آف دی عید" بننا ہے۔ دوسری گیند بھی ویسی ہی تھی لیکن پھر عیدی کا خیال آیا۔ آخر سوچ لیا کہ اب آنے دو۔ تیسری گیند آتے ہی ہم نے "شعیب" بننے کی بجائے "میانداد" بننے کی کوشش کی اور "بولڈ" ہوگئے۔ عید کا سارا مزا کرکرا ہوگیا۔ مگر امید تھی کہ باقی لڑکے ہماری عید کرائیں گے لہٰذا مدثر کو محتاط طریقے سے کھیلنے کو کہا ہماری ٹیم کے

اچھے بیٹسمین ہیں اگرچہ ان کا اسٹائل انتہائی بونگا ہے۔ لیکن گیند سے بالکل نہیں ڈرتے۔ اس لئے اکثر غلط ہٹ کرتے ہوئے آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ اسی باعث وہ سلیم ملک کہلائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ساتھی کے اسکور کو بڑھانے کی کوشش کی لیکن صرف ۱۰ دس کے مجموعی اسکور پر آؤٹ ہوگئے اور اف کیا غضب ہوگیا۔

خیر اب تھرڈ ڈاؤن رضا تھے۔ یہ بھی مانے ہوئے بیٹسمین ہیں۔ ان کے کور ڈرائیو بہت خوبصورت ہوتے تھے۔ لیکن اس صورت میں جب وہ کچھ رن بنالیں۔ ورنہ بولڈ ہو جاتے ہیں۔ اور آج عید کی خوشی میں تو وہ بھی رنز کے انبار لگانے کے خواہاں تھے۔ لیکن افسوس کہ رضا یعنی "میانداد" بھی اپنی بیٹنگ کو کامیاب نہ بنا سکے۔

لیکن یہ ہمارے عمران خان نما "عمران" ہمیشہ ضبط کرتے ہوئے بے ضبط ہو جاتے ہیں۔ فاسٹ سے ڈرتے ہیں لیکن چھکا بھی لگاتے ہیں۔ لیکن آج وہ پہلی ہی بال پر بولڈ ہوگئے۔ کیوں کہ بولر فاسٹ تھے۔ اگر اسپنر ہوتا تو یقیناً کیچ ہوتے بس جناب ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اب ہمارے ایک اور بیٹسمین کریز پر آئے سلیم یوسف کی طرح یہ بھی کبھی ہیلمٹ نہیں پہنتے ہیں۔ کیوں کہ انہیں گیند سے ڈر نہیں لگتا ہے۔ خیر سلیم یوسف "دوست محمد" کو ہم نے ہدایت دے کر بھیجا کہ تم ہمارا نام بدنام نہ کرنا اور کم از کم ٹیم کے لئے کچھ کر کے آنا۔

انہوں نے کپتان کی بات غور سے سنی لیکن پتہ چلا کہ ان کا پٹھا چڑھ گیا۔ بڑی مشکل سے سمجھایا بھئی۔ چاہے پٹھا چڑھے یا فریکچر ہو جائے کھیلنا بہرحال ضرور ہے۔ خیر ہم خود ان کے رنر بن گئے۔ لیکن یہ کیا سلیم یوسف نے کیسا بے تکا شاٹ کھیلا جس پر نہ وہ کیچ ہوئے، نہ ایل بی ڈبلیو، نہ بولڈ۔ بلکہ ہمیں بولڈ کر دیا۔ جی ہاں، اسکوائر پر ایک شاٹ کھیلا کہ ہماری ٹانگ پر لگی اور ہم وہیں ڈھیر ہوگئے۔

ہمارے گھر والے سلیکشن کمیٹی والوں کی طرح ہمیں ہسپتال لے گئے۔ پٹی بندھائی۔ اور عید کے لئے ڈیڈی نے تین سو روپے دیئے۔ اف کیا ایوارڈ تھا مین آف دی میچ کا۔ ویسے نہیں تو ایسے ہی سہی۔ کہئے کیسا رہا؟

ویسے کسی کو بتائیے گا نہیں یہی تجربہ ہم ٹیسٹ پلیئر بن کر آزمائیں گے۔ اگر ہمیں رنر بننے کا موقع ملا تو ....

اطفال نمبر

شیخ عبدالحمید عابد

بہت ہی حسیں ہے یہ اطفال نمبر
جمال یقیں ہے یہ اطفال نمبر
ہے بچوں کی تاریخ کا ایک مخزن
بڑا دلنشیں ہے یہ اطفال نمبر
فضائے ادب ہے مہک بار اس سے
بڑا عنبریں ہے یہ اطفال نمبر
سدا روشنی جس سے ملتی رہے گی
وہ شمع حسیں ہے یہ اطفال نمبر

ہنسانے والی گیس

مہہ وش فاروقی

۱۷۷۲ میں پرسٹ لے (Pristlay) نامی سائنس داں نے اپنی تجربہ گاہ میں نائیٹرک آکسائڈ کو لوہے کے ساتھ گزار کر ایک گیس حاصل کی۔ اس کے بعد ڈے ڈونامی ایک دوسرے سائنس داں نے اس کی خصوصیات کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اسے زیادہ مقدار میں سونگھنے سے ہنسی سی آتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ اس گیس کا نام ہنسانے والی گیس رکھ دیا گیا۔ ویسے سائنس کی اصطلاح میں اسے نائٹرس آکسائڈ کہتے ہیں۔

یہ بے رنگ اور میٹھی خوشبو والی گیس ہے۔ اسے سونگھنے سے نبض کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہنسی آرہی ہو۔ لیکن اس کیفیت کے بعد بھی اگر اسے مزید سونگھا جائے تو انسان بے ہوش ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اگر اس گیس کو ٹھنڈا کر دیا جائے تو یہ سفید رنگ کے ٹھوس کرسٹل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے آپریشن میں اس گیس کو آپریشن والی جگہ کو سُن کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر ماں ناراض ہو

تبسم رضا۔ شیخوپورہ

ایک جوان بہت سخت بیمار ہو گیا اور بستر پر پڑ گیا۔ طبیب نے کہہ دیا کہ اس کی بیماری لاعلاج ہے اس خبر کے سننے سے اس کے رشتہ دار اس کی عیادت کرنے کو گئے جوان موت کی حالت میں تھا درد اور تکلیف سے چیخ رہا تھا کبھی اسے آرام آتا مگر پھر دوبارہ بلبلانے لگتا اس کی حالت عبرتناک تھی پیغمبر اسلام کو اطلاع دی گئی کہ مسلمانوں کا ایک جوان مدت سے بیماری کے بستر پر پڑا ہے اور جان کنی کے عالم میں پڑا ہے آپ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے جائیں شاید آپ کے آنے کی برکت سے اسے آرام آجائے پیغمبر اسلام ؐ نے ان کی دعوت قبول کی اور اس جوان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اس کی پریشانی اور تکلیف نے پیغمبر اسلام ؐ کو متاثر کیا کبھی وہ ہوش میں آتا اور اپنے اطراف میں دیکھتا اور فریاد کرتا اور کبھی بے ہوش ہو جاتا تو تھوڑا سا آرام آجاتا آپ ؐ نے اس سے پوچھا کیوں اتنے پریشان ہو؟ کیوں اتنے رنج میں ہو اور فریاد کر رہے ہو؟ جوان نے آنکھیں کھولیں اور نبی کریم ؐ کے نورانی چہرے کی زیارت کی اور بہت زحمت اور تکلیف سے کہا یا رسول اللہ میں جان چکا ہوں کہ میری عمر آخر کو پہنچ چکی ہے اور میں آخرت کے جہاں کی طرف جا رہا ہوں اب میں دو شکلیں دیکھ رہا ہوں جو میری طرف آرہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ میری روح کو اپنے ساتھ جہنم میں لے جائیں گویا یہ چاہتی ہیں کہ مجھے میرے برے کام کی سزا دیں یا رسول اللہ میں ان دو سے ڈرتا ہوں میری مدد کیجئے۔

حضور ؐ نے ایک لمحے میں سب کچھ سمجھ لیا تھا وہاں بیٹھنے والوں سے فرمایا "اس جوان کی ماں ہے؟" اگر ہے تو اس سے کہو کہ یہاں آئے اس کی ماں بلند آواز سے روتے ہوئی بولی "یا رسول اللہ! میں نے اپنے بیٹے کے لئے بہت تکلیف اٹھائیں کئی کئی راتیں جاگتی رہی تاکہ یہ سو جائے کتنے دنوں میں نے کوشش کی

کہ یہ آرام سے رہے کبھی خود بھوکی رہتی اور اپنی غذا اسے دے دیتی اپنے منہ سے لقمہ نکال کر اس کے منہ میں ڈالتی اس تمام باتوں کے باوجود جب یہ سن بلوغ اور جوانی کو پہنچا تو میری تمام خدمات کو بالکل بھلا بیٹھا اور مجھ سے سختی اور تنگی سے پیش آنے لگا اور مجھے گالیاں تک دینے لگا میرا احترام نہیں کرتا تھا اس کی ان حرکتوں نے میرا دل بہت دکھایا میں نے اس کی اللہ تعالیٰ سے شکایت کی ہے" رسول خدا نے فرمایا۔ "اے ماں! تیرے بیٹے کی حرکتیں پسندیدہ نہ تھیں اور تجھے حق پہنچتا ہے کہ اس سے ناراض ہو لیکن تم پھر بھی ماں ہو اور ماں مہربان اور معاف کرنے والی ہوا کرتی ہے اس کی جہالت کو معاف کر دے اور اس سے راضی ہو جا تاکہ خدا بھی تجھ سے راضی ہو جائے" اس رنجیدہ ماں نے ایک مہربانی کی نگاہ اپنے بیٹے پر ڈالی اور کہا خدایا میں نے تیرے پیغمبر کی خاطر اپنے بیٹے کو بخش دیا ہے تو بھی اسے بخش دے نبی کریمؐ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بیٹے کے حق میں دعا کی اور جوان کے لئے خدا سے مغفرت طلب کی خداوند عالم نے نبی کریمؐ کی دعا اور اس کی ماں کے راضی ہونے کے سبب اس جوان کے گناہ بخش دیئے۔ چنانچہ اس وقت جبکہ جوان اپنی عمر کے آخری لمحات کاٹ رہا تھا اس نے آنکھ کھولی اور مسکرایا اور کہا "یارسول اللہ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ دو خوفناک شکلیں چلی گئیں اور دو خوبصورت اور خندہ پیشانی والے دو فرشتے میری طرف آرہے ہیں۔" اسی طرح اس نوجوان نے اللہ کی وحدانیت اور حضرت محمدؐ کی نبوت کی گواہی دی اس کے بعد وہ مسکرایا اور اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

پاک فوج کے جواں

شیخ عبدالحمید عابد

صداقت کے نغمے سناتے ہیں یہ
شرافت کی دنیا بساتے ہیں یہ
مظالم کی ظلمت مٹاتے ہیں یہ
حریفوں کو نیچا دکھاتے ہیں یہ
ہر اک حال میں کام آتے ہیں یہ
شجاعت کے جوہر دکھاتے ہیں یہ
محبت کا پرچم اڑاتے ہیں یہ
وطن کے لئے خوں بہاتے ہیں یہ
دلاور مسلماں کی جرات ہیں یہ
بہادر سپاہی کی ہمت ہیں یہ
ضعیفوں، اکیلوں کی قوّت ہیں یہ
شب و روز مصروفِ خدمت ہیں یہ
پاک فوج کے جواں
پاک فوج کے جواں

اپریل ۹۱ء کے شمارے کے شعبہ کمسن قلمکار میں واصف اسلم کی تحریر کردہ کہانی "معائنہ" اور مئی ۹۱ء کے تتلی میں اعظم صدیق کی نظم "ننھا شاعر" نقل شدہ تھی۔ دونوں حضرات کو بلیک لسٹ کیا جا رہا ہے۔ ادارہ ثبوت فراہم کرنے پر جنید اختر کراچی اور محمد عثمان بلوچ کراچی کا ممنون ہے۔

روشن مثال

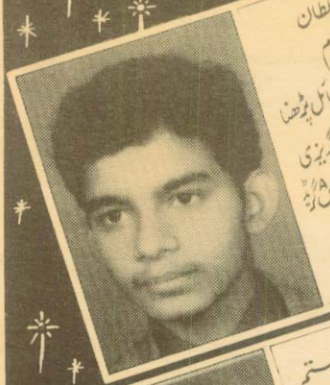

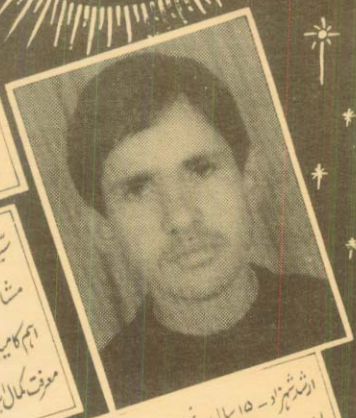

ظفرالدین سلطان
۱۱ سال، نا معلوم
مشاغل: قلمی دوستی، رسائل پڑھنا
پسندیدہ مضمون، انگریزی
اہم کامیابی: میٹرک میں ۵ گریڈ
مظفرالدین۔ جی ۸۶
بلال کالونی، ساہیوال

ارشد شہزاد۔ ۱۵ سال۔ نہم۔ مشاغل: قلمی دوستی کرنا، آنکھ مچولی پڑھنا
پسندیدہ مضمون: بیالوجی۔ اہم کامیابی: جماعت ہشتم میں اوّل
پتہ: معرفت محمد حنیف شاد، کشمیر کالونی، گوجرانوالہ کینٹ

سیّد صلاح الدین۔ ۱۳ سال، ہفتم
مشاغل: کرکٹ کھیلنا۔ انگلش پڑھنا
اہم کامیابی: ساتویں میں اوّل، مباحثہ میں انعام
معرفت کمال اینڈ کمال تحصیل ڈورالائی بلوچستان

لدو میچارو
۱۶ سال، گیارہویں
مشاغل: قلمی دوستی
پسندیدہ مضمون: سائنس
اہم کامیابی۔ میٹرک میں
اے گریڈ
رزاق پان ہاؤس
سجاول ضلع ٹھٹھ، سندھ

زاہد ندیم ہاشمی۔ ۱۳ سال۔ ہشتم
مشاغل: کرکٹ کھیلنا، مطالعہ کرنا۔ پسندیدہ مضمون: انگریزی، ریاضی
اہم کامیابی: جماعت اوّل تا پنجم اوّل پوزیشن
محلہ قریشیاں، شالیمار ٹاؤن۔ لاہور

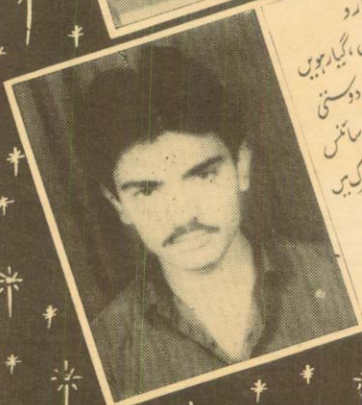

کیا آپ نے بھی کوئی روشن مثال قائم کی ہے؟

اس تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک سکیں گے جنھوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو مثلاً۔ امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام، . کوئی اور کارنامہ ......

○ ...... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہو سکے گا۔

○ ...... آپ کی تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہو سکے گی۔

یاد رہے! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو (BEST OF MONTH) کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تاکہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جاسکے۔

○ ...... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء وطالبات اس میں شریک ہو سکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ...... کوپن کا آنا شرط ہے، جو صفحہ نمبر ۱۳۵ پر موجود ہے۔

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جا بجا کوپن چھاپنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام ..... کلاس ..... عمر .....

ارسال کردہ کل رقم ..... بذریعہ ..... دستخط .....

پتا .....

.....

روشن مثال میں شرکت کا کوپن

نام ..... عمر ..... جماعت .....

مشاغل ..... پسندیدہ مضمون .....

کوئی اہم کامیابی .....

پتہ .....

امی ابو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

ہما سلیم

ہمارے ایک عزیز اپنے اہل خانہ کے ساتھ کافی عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ ان کا شمار امریکہ کے ان خوش قسمت پاکستانیوں میں ہوتا ہے۔ جو اپنے معیارِ ملازمت، سماجی مرتبے اور مال و دولت کے حوالے سے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کا پاکستان آنا ہوا تو ہماری ملاقات بھی ان سے ہوئی۔ سلام دعا، خیر و عافیت اور دیگر تمہیدی باتوں کے بعد جب ہم نے ان کے بچوں کے بارے میں معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ۔ "بچے صبح جلدی اٹھ جاتے ہیں۔ ناشتے کے بعد گھروں میں اخبار تقسیم کرتے ہیں اور پھر تیار ہو کر اسکول جاتے ہیں۔"

ایک دولت مند اور صاحب حیثیت شخص کے منہ سے یہ بات ہمیں بڑی عجیب لگی کہ ان کے بچے مال و دولت کی فراوانی کے باوجود گھروں میں اخبار ڈالتے ہیں ہم سے رہا نہیں گیا اور ہم نے اپنی حیرت کا اظہار کر ہی دیا۔

"آخر ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے کہ آپ کے معصوم بچے گھروں میں اخبار ڈالنے پر مجبور ہیں۔"

میرے سوال کے جواب میں ہمارے معزز مہمان نے انتہائی تحمل سے جو جواب دیا اسے ہم اپنے ہاں کے والدین کو بتانا ضروری سمجھتے ہیں۔

ہمارے مہمان کا جواب یہ تھا۔ "میرے بچوں کو گھروں میں اخبار ڈالنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ نہ ہی انہیں اس کام سے اتنی بڑی رقم ملتی ہے کہ جسے چھوڑا نہ جا سکتا ہو۔ ہمارے پاس اللہ کا عطا کردہ بہت کچھ ہے۔ بس بات اتنی سی ہے کہ میں بچوں کو ان کے بچپن ہی میں یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ زندگی کے مسائل کتنے شدید ہیں..... میں چاہتا ہوں وہ تن آسان نہ ہو جائیں۔ آنے والے وقت کے مسائل کو ابھی سے سمجھیں اور ان میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ بقاء کی جدوجہد بہت آسان نہیں۔ اگر آج میرے بچے کچھ سختیاں سہہ لیں گے تو آنے والے وقت کے مسائل کا مقابلہ بہتر طریقے سے کر سکیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کے اس کام کرنے سے دل بھی دکھتا ہے مگر میں یہ جانتا ہوں کہ میں ٹھیک ہوں۔"

کمسن ایڈیٹر

آپ مانیں یا نہ مانیں یہ گیارہ سالہ بچی امریکہ کے ایک مشہور انگریزی اخبار کے بچوں کے صفحے کی ایڈیٹر ہے۔ مونیکا بلنڈ نامی یہ بچی ایک کتاب کی مصنفہ بھی ہے اس کا کہنا ہے کہ میں یا تو کتاب لکھتی ہوں یا پڑھتی ہوں۔ اسے جانوروں سے بہت پیار ہے اسی لئے وہ کسی ایسے اخبار یا رسالے کی مدیرہ بننا چاہتی ہے جو فطرت کے موضوع پر تحریریں شائع کرتا ہو۔

آپ نے شائد نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

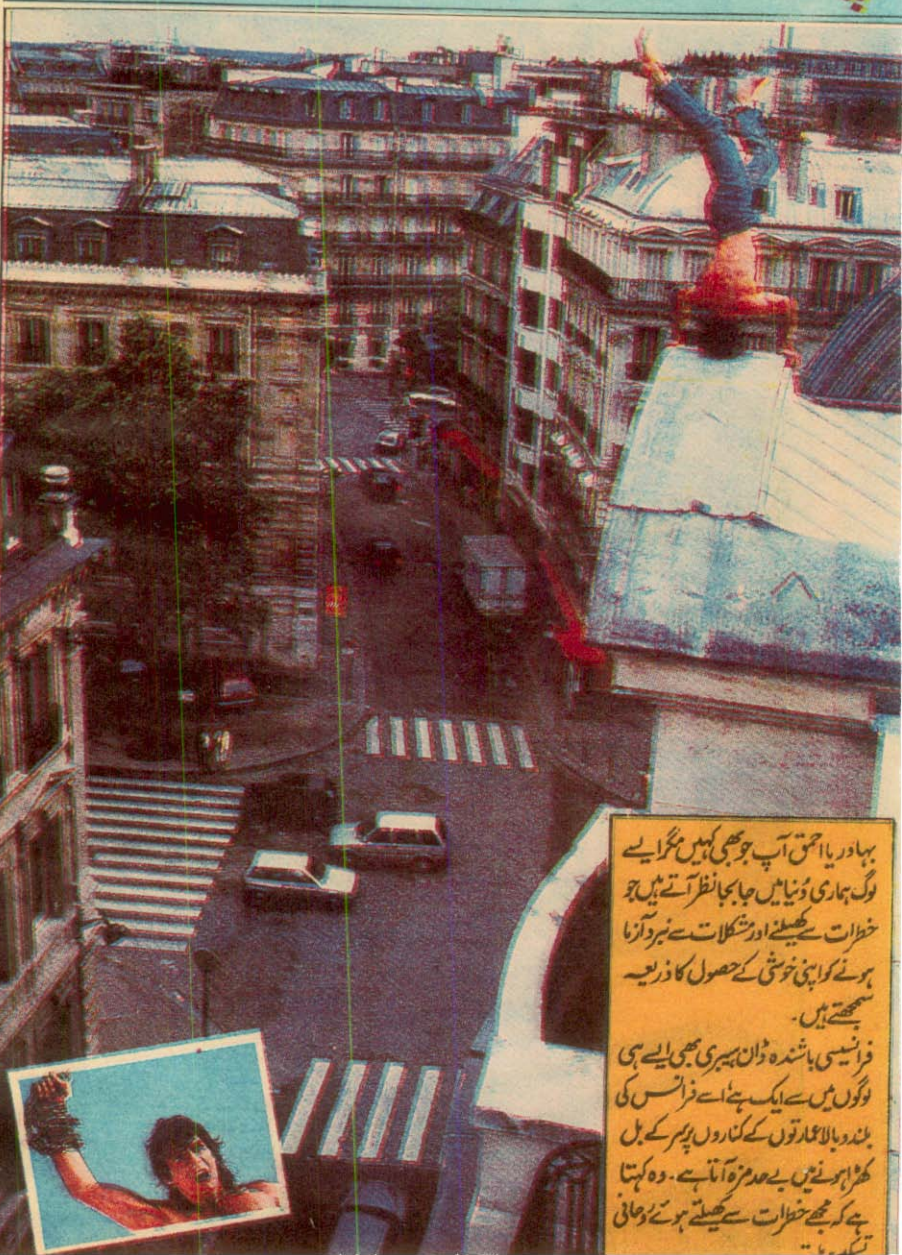

بہادر یا احمق آپ جو بھی کہیں مگر ایسے لوگ ہماری دُنیا میں جا بجا نظر آتے ہیں جو خطرات سے کھیلنے اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کو اپنی خوشی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

فرانسیسی باشندہ ڈان ہیبری بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ اسے فرانس کی بلند و بالا عمارتوں کے کناروں پر سر کے بل کھڑا ہونے میں بے حد مزہ آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے خطرات سے کھیلتے ہوئے روحانی تسکین ملتی

سب دوستوں کے لئے
ایک دوستانہ مشورہ

پیارے دوستو!

آپ کی طرح مجھے بھی سوئیٹس، ٹافیز اور ببل بے حد پسند ہیں لیکن میں خریدتے وقت بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں اور صرف مے فیئر خریدتی ہوں۔
کیونکہ یہ بہترین اجزا سے صحت کے اصولوں پر تیار ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ مزیدار ہیں۔

—— آپ سب دوستوں کے لئے، میرا دوستانہ مشورہ ——
ہمیشہ مے فیئر کی سوئیٹس اور ٹافیز کھائیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

■ مے فیئر سوئیٹس اور ٹافیز ■ مے فیئر ببل ■ مے فیئر ملکا چیو
■ مے فیئر فروٹا چیو (اورنج اور اسٹرابیری)

mayfair
-the sweet favourites

REGD. No. M-266

JUNE 1991

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

نیا بلیو بینڈ مارجرین

نئی خوبصورت پیکنگ میں!
اَب . . . اور بھی زیادہ پُر ذائقہ
بہتر غذا . . . بہتر مزا!
نیا بلیو بینڈ مارجرین

وٹامن اے اور ڈی سے بھرپور

لذّت کے ساتھ ساتھ . . . صحت بھی!